سلسلۂ مطبوعات انجمنِ ترقیٔ اُردو (ہند) نمبر ۲۰۹

خطباتِ عبدالحق

حصۂ دوم

از

جناب ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب بالقابہ

(معتمد اعزازی انجمنِ ترقیٔ اُردو ہند)

شائع کردہ

انجمنِ ترقیٔ اُردو (ہند) دہلی

طبع اوّل ایکہزار — ۱۹۴۴ء — قیمت مجلد عہ بلا جلد عہ

سلسلۂ مطبوعاتِ انجمنِ ترقیٔ اُردو (ہند)، نمبر ۲۰۹

خطباتِ عبدالحق

حصۂ دوم

از

جناب ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب بالقابہ

معتمدِ اعزازی انجمن ترقیٔ اُردو (ہند)

شائع کردہ

انجمنِ ترقیٔ اُردو (ہند) دہلی

طبع اوّل — سنہ ۱۹۴۴ء — قیمت مجلد عیہ بلا جلد عہ

فہرست

خطبۂ صدارت اُردو کانفرنس ناگ پور

۴ مارچ ۱۹۴۰ء

ای حضرات! اگرچہ آپ کے شہر کا نام ناگ پور یعنی ناگوں بھرا ہے لیکن یہ مجھے بہت عزیز ہے اس لیے کہ یہیں مجھے وہ بیش بہا سبق ملا ہے جسے میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ یہیں وہ واقعہ پیش آیا جسے اب ایک گونہ تاریخی حیثیت حاصل ہو گئی ہے اور جس نے ہماری تحریک میں قوت پیدا کر دی اور ملک کے اُردو داں طبقے کی آنکھیں کھول دیں۔ میں اس واقعہ کا ذکر ہمیشہ شکر گزاری کے ساتھ کرتا ہوں اور جب تک زندہ ہوں اسے شکر گزاری کے ساتھ یاد کروں گا۔ میں اسے اب ناگ پور نہیں، بلکہ جاگ پور کہتا ہوں کیوں کہ اس نے مجھے اور آپ کو جگایا۔

میرے ایک دوست نے جو بہت معقول پسند اور صاحبِ فکر ہیں مجھ سے ایک روز فرمایا کہ جب کہ گاندھی جی نے اپنا طرزِ عمل بدل دیا ہے اور اب "ہندی ہندُستانی" یا ہندی یعنی ہندستانی چھوڑ کر ہندستانی کہنے لگے ہیں جیسا کہ ان کی پشاور والی تقریر اور اس پیغام سے ظاہر ہے جو انھوں نے آل انڈیا اُردو کانفرنس دہلی کو بھیجا تھا تو اب اس پرانے قصّے کو بار بار دُہرانا کچھ

اچھا معلوم نہیں ہوتا ۔ یہ سچ ہے لیکن ان کی تجویز اور کوششیں جو زہر پھیلا چکی ہیں اور جن کا اثر روز بہ روز بڑھتا جاتا ہے اس کا کیا علاج ؟ نیز اُس پیغام سے جو انھوں نے اُردو کانفرنس کو بھیجا تھا یہ مترشح ہوتا ہے کہ ہندی ہندوؤں کی اور اُردو مسلمانوں کی زبان ہے ۔ جہاں تک اُردو کا تعلق ہے ہم اِسے تسلیم نہیں کرتے کہ یہ مسلمانوں کی یا کسی ایک فرقے کی زبان ہے ۔ اور نہ کوئی واقفِ حال اِسے قبول کرے گا ۔ اُردو زبان کی تاریخ اور اس کی ساخت صاف بتا رہی ہے کہ یہ زبان بہ قول سر تیج بہادر سپرو کے "ہندو مسلمانوں کا ناقابلِ تقسیم ترکہ ہے"۔ ممکن ہے کہ یہ گاندھی جی کا سہو ہو لیکن ان کا سہو دوسروں کے سوچے سمجھے اور ارادی اقوال سے زیادہ قوت رکھتا ہے اور اس لیے اندیشہ ہے کہ یہ مغالطہ مزید غلط فہمیوں کا موجب نہ ہو ۔

ہم سے حال ہی میں لیڈر اخبار کے ایک قابل ہندو نامہ نگار نے یہ دریافت کیا کہ ہم جو بار بار یہ کہتے ہیں کہ اُردو ہندو مسلمان دونوں کی مشترکہ زبان ہے تو یہ انکشاف کب سے ہوا ؟ کیا اس سے قبل بھی کبھی ایسا کہا گیا تھا ؟ بے شک یہ ہم نے حال ہی میں کہا ہے اور بار بار کہا ہے اور بار بار کہیں گے ۔ اس سے پہلے اس کے کہنے کی ضرورت نہ تھی اس لیے کہ یہ ایک مسلمہ امر تھا اور کسی کو اس میں شک نہ تھا اور ہر شخص جانتا تھا اور ہندو مسلمان دونوں اِسے اپنی زبان سمجھتے تھے ۔ اس وقت اس کے جتانے کی ضرورت ہی نہ تھی ۔ جتانا تو درکنار اس کا خیال بھی نہ آسکتا تھا ۔ اس کی ضرورت اس وقت محسوس ہوئی جب کہ ہندی کے حامیوں نے اس سے انکار کرنا شروع کیا اور ایک بنی بنائی تہذیب اور ایک بنی بنائی زبان سے منہ موڑ کر نئی بھاشا اور نئی تہذیب کا ڈول ڈالا، وہ زبان اور تہذیب جس کے بنانے، سنوارنے اور ترقی دینے میں

ہمارے اور اُن کے بزرگوں نے صدیوں محنت کی اور جوان کی نیک نیتی اور آپس کے ملاپ جلاپ اور اتحاد کی عزیز نشانی ہے، تعجب ہے کہ اس کو مٹاتے ہوئے اُن کا دل نہیں دُکھتا!۔

جدید ہندی کے مدعی سب سے بڑی دلیل ہندی کے حق میں یہ پیش کرتے ہیں کہ یہی زبان ایک ایسی ہے جو دیہات میں کام آسکتی ہے۔ یہ دلیل محض خیالی اور فرضی ہے، مدراس، بنگال، پنجاب، گجرات، مہاراشٹر کا تو ذکر ہی نہیں کہ ان کی بولیاں جدا جدا ہیں۔ یوپی، بہار، سی پی، سنٹرل انڈیا، راجپوتانہ کے علاقوں کو لیجیے جن کی زبان ہندی کہی جاتی ہے اور دیکھیے کہ ان میں کس قدر مختلف بولیاں بولی جاتی ہیں۔ مثلاً برج بھاشا، قنوجی، بندیلی، بانگڑو، مالوی، راجستانی، گڑھوالی، اودھی، بگھیلی، چھتیس گڑھی وغیرہ۔

نتیجہ یہ ہے کہ ایک علاقے کا دیہاتی دوسرے علاقے کے دیہاتی کی زبان نہیں سمجھ سکتا۔ بندیلی علاقے کا رہنے والا بہاری دیہاتی کی زبان سمجھنے سے قاصر رہتا ہے۔ اب میں ہندی کے ان مدعیوں سے پوچھتا ہوں کہ ان کی نئی ہندی کس علاقے کے دیہات سے تعلق رکھتی ہے۔ شاید کسی سے بھی نہیں۔ دُنیا کے ہر ملک میں شہر کی زبان دیہات کی زبان سے کم و بیش مختلف ہوتی ہے لیکن کہیں یہ اُلٹی کوشش نہیں کی گئی کہ دیہات کی زبان شہروں میں رائج کی جائے۔ ہمارے ملک میں یہ فرق زیادہ اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں جہالت زیادہ ہے۔ اگر تعلیم عام ہو جائے تو یہ فرق خود بہ خود کم ہو جائے گا۔ اس کا علاج یہ نہیں ہے کہ ہم دیہاتیوں کی زبان اختیار کر لیں جو ایک ناقابلِ عمل اور مضحکہ خیز حرکت ہوگی۔ صحیح علاج یہ ہے کہ تعلیم عام کر دی جائے۔

ایک بار نہیں بارہا اس کا تجربہ ہو چکا ہے کہ جب دیہاتیوں کے کسی مجمع

میں اس زبان میں تقریر کی گئی جسے ہمارے اس زمانے کے بعض معزز لیڈر ہندی کہتے ہیں تو کسی کے کچھ پلّے نہ پڑا اور مجمع نے باتیں کرنی یا حقّے کے دم لگانے شروع کر دیے۔ پنڈت جواہر لال نہرو سے بڑھ کر کسی نے ہندستان کے دیہات کا دورہ نہیں کیا۔ وہ نہ کسی دیہات کی بولی جانتے تھے اور نہ جدید ہندی سے واقف ہیں۔ انھوں نے اسی زبان میں تقریریں کیں ، اور ایک نہیں ہزاروں تقریریں کیں ، جسے ہم اُردو اور انگریز ہندستانی کہتے ہیں۔ اور اس اعتبار سے وہ کانگرس کے سب سے زیادہ کامیاب اور نغزگو پریزیڈنٹ ثابت ہوئے۔ اگر وہ مختلف علاقوں اور ہر علاقے کی مختلف بولیوں کے سیکھنے کی کوشش کرتے تو ان کا سارا زمانۂ صدارت اسی میں ختم ہو جاتا اور ایک بولی بھی نہ آتی۔

آپ ہی کے اس شہر میں جب مسز پنڈت تشریف لائیں اور بڑی دھوم سے ان کا استقبال ہوا اور ان کے اعزاز میں ڈاکٹر کھرے صاحب کی صدارت میں جلسہ ہوا تو مسز پنڈت اور ڈاکٹر کھرے نے کس زبان میں تقریریں کیں ؟ کیا وہ کوئی دیہاتی بولی تھی یا ہندی ؟ نہیں ، یہ وہی غریب اُردو جس پر آج ہر طرف سے حملے دے ہو رہی ہے۔

سوباش چندر بوس نے یو۔پی ، بہار ، سی۔پی میں بارہا دورے کیے اور سینکڑوں جلسوں میں تقریریں کیں۔ وہ بڑے مقرر ہیں۔ ہزاروں آدمیوں نے ان کی تقریریں سُنی ہیں۔ وہ بنگالی ہیں لیکن وہ سیدھی سادی اُردو میں گھنٹوں تقریر کرتے ہیں اور لوگ بلا تکلف سمجھتے ہیں اور متاثر ہوتے ہیں۔ یہ ایک مثال ہے ایسی سینکڑوں اور ہزاروں مثالیں ہیں جو اس بات کو ثابت کرتی ہیں کہ ہندستان کی اگر کوئی عام زبان ہے تو وہ اُردو ہی ہے۔

حال ہی میں ہندی پرچارنی سبھا دہلی کا ایک جلسہ تھا۔ اس کے صدر جناب پنڈت شری کانت مالویہ تھے۔ انھوں نے بہت صاف ستھری اور فصیح اُردو میں تقریر فرمائی لیکن تھی اُردو کی مخالفت میں۔ انھوں نے اپنی تقریر کے دوران میں یہ بھی فرمایا کہ مجھے اُردو سے پریم ہے۔ ہمیں یہ سن کر خوشی ہوئی۔ لیکن ہمارا اور ہندی کا معاملہ بالکل دوسرا ہے۔ ہمیں ہندی سے پریم ہی نہیں۔ ہم اُس کے عاشق ہیں۔ ہم نے اُسے ہندستان کے گوشے گوشے میں پہنچایا اور ہندستان کے باہر تک ملکوں ملکوں لے گئے۔ ہماری زبان کی تو بنیاد وہی ہندی پر ہے۔ اگر ہم اپنی زبان سے ہندی کا عنصر خارج کر دیں تو ہماری زبان کا وجود ہی نہیں رہ سکتا۔ البتہ آج کل کے ہندی والے اپنی زبان سے اُردو فارسی عربی کے لفظ نکال کر بھی اپنی زبان قائم رکھ سکتے ہیں کیوں کہ ان کا میلان خاطر سنسکرت کی طرف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جنوبی ہند اور خاص کر تامل ناڈو والے ان سے بدگمان ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ ہندی کے پردے میں سنسکرت پھیلانا اور ان کی زبان اور تہذیب کا گلا گھونٹنا چاہتے ہیں۔

اسی مبارک شہر میں ۱۹۳۵ء کے مبارک سال میں بھارتیہ ساہتیہ پرشد کا اجلاس ہوا تھا جس کے صدر جناب گاندھی تھے۔ آپ جانتے ہیں کہ گاندھی جی نے ایک وکیلانہ، منطقیانہ اور جدّت آفریں دماغ پایا ہے۔ انھوں نے اس جلسے میں ایک لفظ "ہندی ہندستانی" گھڑا تھا۔ جب اُن سے پوچھا گیا کہ ہندی سے آپ کی کیا مراد ہے تو فرمایا کہ وہ زبان جو کتابوں میں ہے اور بول چال میں نہیں۔ اور جب یہ پوچھا گیا کہ ہندستانی سے آپ کا مطلب کیا ہے تو فرمایا وہ زبان جو بول چال میں تو ہے مگر کتابوں میں نہیں آتی۔ یہ اُس شخص کا قول ہے جو کُل ہند ہندی سمیلن کا صدر ہے۔ جس نے ہندستان بھر میں ہندی کو

عام زبان بنانے کا بیڑا اٹھایا ہے، جس کے ایک لفظ پر کیا راجا اور کیا پرجا دونوں کے کان لگے ہوئے ہیں۔ اس قول سے صاف ظاہر ہے کہ ملک کی زبان نہ تو ہندی ہو سکتی ہے نہ ہندستانی، کیوں کہ ایک بولنے میں آتی ہے تو کتابوں میں نہیں آتی اور دوسری کتابوں میں لکھی جاتی ہے تو بول چال میں نہیں آتی۔ اب رہ گئی اُردو سو اس کے متعلق کسی پوچھ گچھ کی ضرورت نہیں ہا کیوں کہ یہ بولنے میں بھی آتی ہے اور کتابوں میں بھی۔ یعنی بول چال کی زبان بھی ہے اور ادب و انشا کی بھی اس لیے یہی زبان اس دیس کی "راشٹر بھاشا" یعنی عام زبان ہو سکتی ہے۔

حضرات اُردو کی پیدایش اور اس کی تاریخ کوئی معمولی واقعہ نہیں یہ ہندستان کی تاریخ کا نہایت اہم اور عظیم الشان واقعہ ہے۔ مورخوں نے اس بارے میں ایسی غفلت برتی جو ناقابلِ معافی ہے۔ وہ بادشاہوں کی فتوحات اور لڑائیوں اور اُن کے درباروں اور جشنوں کا حال تو بڑی آب و تاب سے بیان کرتے ہیں لیکن ایک ایسے اہم واقعے کو نظر انداز کر جاتے ہیں جس نے ذہنی اور ادبی انقلاب پیدا کر دیا اور جو اصل ہندستانی تہذیب کی جان ہے۔ یہ اُس وقت وجود میں آئی جب کہ ملک ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا، ہر رجواڑہ خود مختاری کا دعوے دار تھا۔ ملک میں اس سرے سے اُس سرے تک عجب بے سر و سامانی انتشار اور بے ترتیبی پھیلی ہوئی تھی۔ آپس کی پھوٹ نے سارے کام درہم برہم کر رکھے تھے۔ کوئی ایک ملک تھا اور نہ کوئی نظام۔ ایسے وقت میں مسلمان یہاں آئے۔ بے ترتیبی اور بدنظمی کو رفع کیا اور امن قائم کیا، نئے قواعد اور نئے آئین نافذ کیے۔ ایک ملک ایک زبان اور ایک تہذیب کی بنیاد ڈالی۔ وہی تہذیب اصل ہندستانی تہذیب اور وہی زبان اصل ہندستانی زبان ہے کیوں کہ ان میں ہندو مسلمان دونوں کا رنگ روپ موجود ہے۔

۱۸۰۰ء میں مسٹر ڈبلیو۔ بی بیلی نے (جو کچھ دنوں کے لیے گورنر جنرل بھی ہو گئے تھے) ہندستانی زبان پر ہندستانی زبان ہی میں ایک مقالہ لکھا تھا جس میں بہ دلائل یہ ثابت کیا ہے کہ ہندستانی زبان ہی ہندستان کی عام زبان ہو سکتی ہے۔ یہ مقالہ جوں کا توں ہندی کے رسالے وشال بھارت میں شائع ہوا ہے۔ اس تحریر سے آپ کو معلوم ہوگا کہ ہندستانی زبان سے کیا مُراد ہے۔ چوں کہ ہندستانی کا لفظ زبان کے معنوں میں سب سے اوّل اہلِ یورپ اور خاص کر انگریزوں نے استعمال کیا۔ اس لیے انھیں کی شہادت پیش کرنی ضرور ہے تاکہ معلوم ہو کہ وہ ہندستانی کس زبان کو کہتے تھے۔ یہاں میں اس کے چند جملے پڑھ کر سناتا ہوں تاکہ آپ اندازہ کر سکیں کہ وہ جسے ہندستانی زبان کہتا ہے وہ کون سی زبان ہے۔

مسٹر بیلی کے مقالے کے ابتدائی چند جملے یہ ہیں :-

"ہندستانی زبان جس کا ذکر میرے دعوے میں ہے اس کو ہندی، اُردو اور ریختہ بھی کہتے ہیں اور یہ مرکب عربی اور فارسی و سنسکرت یا بھاشا سے ہے اور یہ پچھلے اگلے زمانے میں تمام ہند میں رائج تھی۔

عرب سوداگروں کی آمد و رفت اور مسلمانوں کی اکثر یورش اور حکومت قیامی کے باعث الفاظ عربی اور فارسی اسی پُرانی بولی میں بہت مل گئے اور ایک نئی زبان بن گئی جیسے کہ بنیادِ قدیم پر تعمیرِ نو ہووے۔

آخر الامر یہ بولی ہندستان میں سب کو عزیز اور پیاری ہوئی اور اکثر متوطنوں نے اسی مرکب زبان پر راغب ہو کر اس کو اخذ کیا کہ اپنے ایسے معاملات جن کا استحکام موقوف تحریر پر نہ ہو اِن میں اسی سے کلام کریں۔"

سارا مقالہ اسی طرز میں لکھا گیا ہے۔ اسے پڑھ کر ہر شخص بلا تامّل یہ کہہ دے گا کہ یہ تو بعینہٖ وہی زبان ہے جسے ہم اُردو کہتے ہیں۔ ہندستانی سے ہمیشہ یہی زبان

مُراد لی جاتی تھی اور مسٹر بیلی بھی اپنی اس تحریر کی زبان کو ہندستانی ہی کہتے ہیں۔ ہندستانی اور اُردو کا امتیاز آج کل کا پیدا کیا ہوا ہے۔ سب سے اول گروس نے یہ امتیاز قائم کیا اور اس کے بعد گریرسن نے اسے رواج دیا اور پھر بہت سے دوسرے لوگ ان کی پیروی کرنے لگے۔ اور یہ امتیاز بھی اس سے زیادہ نہیں کہ آسان اُردو کا نام ہندستانی ہے۔ بہر حال ہے وہ اُردو ہی۔

اب میں آپ کے صوبے کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔

یہ سب جانتے ہیں کہ مغلیہ حکومت میں دفتری اور سرکاری زبان فارسی تھی اور شمالی ہند کے تمام علاقوں (یعنی بنگال بہار، یو۔ پی۔ پنجاب) میں نیز سنٹرل انڈیا، راجپوتانہ اور اس کے متعلقہ تمام دیسی ریاستوں میں اور جنوب میں حیدرآباد اور میسور تک فارسی کا رواج تھا۔ آپ کے صوبے میں بھی بھونسلوں کے عہد میں ناگ پور کی سرکاری اور دفتری زبان فارسی تھی۔ انگریزی حکومت کے بعد جیسا کہ دوسرے صوبوں اور علاقوں میں فارسی کی جگہ اُردو نے لے لی تو یہاں کی دفتری زبان بھی اُردو ہوگئی۔ لیکن کچھ عرصے بعد جب ہندستان کی تقسیم سیاسی مصالح کی بنا بر صوبوں میں ہوگئی تو اُردو یہاں سے رخصت ہوگئی اور مرہٹی اور ہندی میں کارروائی ہونے لگی۔ اگرچہ اُردو دفتروں سے رخصت کر دی گئی۔ لیکن صوبے سے رخصت نہیں ہوئی بلکہ وہ اپنی فطری صلاحیت اور مقبولیت کی وجہ سے بڑھتی ہی چلی گئی۔ بول چال اور کاروبار کی زبان اب بھی اُردو ہے۔ اس کے علاوہ تجارت اور آمد و رفت کی آسانیوں کی وجہ سے پنجاب اور یو۔ پی کے بہت سے لوگ یہاں آکر بس گئے اور ان کی بدولت نامعلوم طور پر اُردو کا رواج بڑھتا رہا۔ یہ رواج اور بڑھتا اور ترقی کرتا اگر اس کے راستے میں بعض رکاوٹیں نہ آجاتیں۔ یہ رکاوٹیں بہت کچھ

ہماری اور ہمارے بھائیوں کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ مانٹیگو چیمسفورڈ ریفارم کے بعد جب قلمدانِ وزارت ہندستانی وزیروں کے مبارک ہاتھوں میں آیا تو کبھی اقتصادی بدحالی اور کبھی طالب علموں کی کمی کے حیلے سے سرکاری مدارس سے اردو خارج کردی گئی اور ثانوی تعلیم میں اُردو پڑھانے کا بارِ کُلّیتہً اسلامی انجمنوں کے کم زور شانوں پر ڈال دیا گیا۔ ان انجمنوں نے جہاں تک بن پڑا، اپنی بساط کے موافق بہت کچھ کیا اور کر رہی ہیں لیکن یہ سارے صوبے کا بوجھ کیوں کر اٹھا سکتی ہیں اور ہر مقام کو جبل پور جیسی انجمنیں کہاں نصیب ہو سکتی ہیں۔

اب آپ کے صوبے میں اُردو کی حالت یہ ہے کہ ایک برار میں تو (جو ریاست حیدرآباد کا ٹکڑا تھا) اُردو مدارس کی تعداد نسبتاً زیادہ ہے۔ وہاں دیہاتی رقبے میں بھی اُردو کے ابتدائی مدرسے پائے جاتے ہیں۔ جو سی پی کے علاقے ہیں اُن میں تقریباً معدوم ہیں۔ سی پی کے شہروں میں تو (اور شہر ہی کتنے ہیں) کچھ نہ کچھ اُردو کی تعلیم کا انتظام ہے بھی لیکن دیہات میں اُردو کا نام ونشان نہیں۔ ساگر، بیتول، ہوشنگ آباد اور چھندواڑہ وغیرہ کی ڈسٹرکٹ کونسلوں کے تحت ایک اُردو اسکول بھی نہیں۔ اگرچہ ان اضلاع میں متعدد مقامات ایسے ہیں جہاں مسلمانوں کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہے اور جن کی مادری زبان اُردو ہے۔ شہروں میں اُردو کے جو ابتدائی مدارس میونسپلٹیوں کے زیرِ انتظام ہیں اُن کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ نہ ان مدرسوں کے لیے مناسب مکان ہیں نہ فرش نہ فرنیچر۔ اور سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ انسپکٹر صاحبان جو ان مدرسوں کی نگرانی کے لیے مقرر ہیں وہ اُردو سے بے بہرہ ہیں۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ تعلیم کی طرف سے جس قدر بھی غفلت ہو کم ہے۔

اکثر مقامات کے ثانوی مدارس میں اُردو مضمون کی حیثیت سے بھی نہیں پڑھائی جاتی۔ اس لیے ان بچوں کے لیے جنھوں نے اُردو پرائمری مدرسوں میں تعلیم پائی ہو صرف دو رستے ہیں۔ یا تو وہ غیر اضلاع یعنی دُور دراز مقامات میں جاکر ایسے مدرسوں میں تعلیم حاصل کریں جن میں اُردو پڑھائی جاتی ہو یا ابتدائی تعلیم اُردو میں حاصل کرنے کے بعد مقامی مدرسوں میں ہندی اور مرہٹی کے ذریعے تعلیم حاصل کریں۔ پہلی صورت صرف امیروں کے لیے ہو اور دوسری شق تعلیمی نظر سے سخت مضر ہو۔

ان حالات میں جو ابھی بیان کیے گئے ہیں، اُردو کے پنپنے کی توقع مشکل سے ہوسکتی ہو۔ کیا آپ کی غیرت یہ گوارا کرے گی کہ وہ زبان جو آپ ہی کو نہیں، ملک کے بہت بڑے حصّے کو عزیز ہو رفتہ رفتہ مٹ جائے اور اُس کے ساتھ وہ تہذیب بھی رخصت ہوجائے جو صدیوں میں بنی اور پختہ ہوئی تھی اور جس میں ہندستان کی ہر قوم کا حصّہ ہو اس کی اصلاح لازم ہو لیکن اصلاح خود بخود نہیں ہوتی۔ اس کے لیے بہت جتن کرنے پڑتے ہیں۔ بہت محنت مشقت اٹھانی پڑتی ہو اور بہت کچھ ایثار کرنا پڑتا ہو۔ آپ چاہیں اور دل پر رکھ لیں تو یہ مشکل کچھ نہ کچھ ضرور آسان ہوسکتی ہو۔

اب میں چند تجویزیں آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ ان پر غور فرمایئے اور اگر آپ کے خیال میں مناسب ہوں تو آج ہی سے ان کو عمل میں لانے کا ڈول ڈال دیجیے۔

۱۔ یہیں نہیں ہر صوبے میں پرائمری تعلیم کا تعلق میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ کونسلوں یا ڈسٹرکٹ بورڈوں سے ہو۔ اور یہیں نہیں ہر جگہ یہ شکایت ہو کہ ان کے ہاتھوں انصاف نہیں ہوتا۔ آپ نے ہماری زبان

کے آخری پرچے میں بابو سمپورنانند صاحب سابق وزیر تعلیم یوپی کا خط پڑھا ہوگا۔ انھیں بھی یہی شکایت ہے۔ وزیر ہو کر بھی وہ کچھ نہ کر سکے تو دوسرا کیا کر سکتا ہے۔ اُن کی رائے میں ان اداروں کو اس قدر زیادہ اختیار حاصل ہیں کہ گورنمنٹ بھی مجبور ہو جاتی ہے اور مداخلت نہیں کر سکتی۔ اس لیے ان کے اختیارات تعلیمی معاملات میں کم کر دینے چاہئیں۔ اس میں تو شاید آپ کو فی الحال کامیابی نہ ہوسکے، لہٰذا کم سے کم یہ کوشش کی جائے کہ جہاں تک اُردو تعلیم کا تعلق ہے اس کا انتظام اس کے ہاتھ سے نکال کر حکومت خود اپنے ہاتھ میں لے لے۔ کیوں کہ موجودہ حالات میں میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ کونسلوں سے یہ امید رکھنا کہ وہ اُردو مدرسے قائم کریں گی، یا آپ کی تجویزوں پر ہمدردانہ غور فرمائیں گی، خیال باطل ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے دل بدل جائیں لیکن دلوں کا بدلنا آپ کے تو کیا گاندھی جی کے بس میں بھی نہیں جیسا کہ آپ ودیا مندر اسکیم کے معاملے میں دیکھ چکے ہیں۔ اس لیے اس کا انتظار نہ کیجیے اور اپنی ہمت اور کوشش پر بھروسا کر کے جو کچھ بھی ہو سکتا ہے کرنا شروع کر دیجیے۔

۲۔ دوسری یہ کوشش ہونی چاہیے کہ ہر مڈل اسکول اور ہائی اسکول میں اُردو میں تعلیم کا انتظام کیا جائے۔

۳۔ اُردو مدرسوں کی نگرانی کے لیے حکومت ایسے انسپکٹر مقرر کرے جو اُردو داں ہوں۔

۴۔ کالجوں میں اُردو تعلیم کا معقول انتظام ہو۔

۵۔ اُردو کتب خانوں کو حکومت اور لوکل سیلف گورنمنٹ کی طرف سے کافی امداد دی جائے۔

۶۔ حکومت اُردو کے شبینہ مدارس قائم کرے یا ان انجمنوں کو جو اُردو کے شبینہ مدارس چلاتی ہیں کافی امداد دے۔

۷۔ عدالتوں اور دفتروں میں اُردو رسم خط کے استعمال کی بھی اجازت ہو۔

۸۔ جو لوگ اُردو کو اپنی مادری زبان کہتے ہیں اور جہاں جہاں ضرورت ہو اُردو مدارس قائم کریں اور قائم کرنے کے بعد ان کا انتظام حکومت یا نیم سرکاری اداروں کے سپرد کر دیں۔ اگر اسمبلی، میونیپل اور ڈسٹرکٹ کونسل کے ارکان اس باب میں تھوڑی سی بھی کاوش کریں تو بہت کچھ کامیابی ہو سکتی ہے۔

۹۔ جن مکتبوں میں قرآن شریف پڑھانے کا انتظام ہے وہاں کوشش کر کے اُردو پڑھانے کا بھی بندوبست کیا جائے۔

۱۰۔ نجی خط و کتابت اور بہ شرطِ امکان کاروباری مراسلت اُردو میں کی جائے یعنی آرڈر فارم اور خطوں کے پتے اُردو میں لکھے جائیں۔ دکانوں کے سائن بورڈ اُردو میں ہوں۔

۱۱۔ سب سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ دیہات میں اُردو مدارس کا سلسلہ قائم کیا جائے۔ اس معاملے میں سی پی والوں کو برار سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ کوئی وجہ نہیں کہ اگر آپ آمادہ ہو جائیں تو اتنا بھی نہ کر سکیں جو اہلِ برار نے کیا ہے۔

۱۲۔ ذی حیثیت لوگ چھوٹے پیمانے پر اُردو کے مدرسے قائم کرنے کی کوشش کریں۔

۱۳۔ اُردو کی بقا و تحفظ اور اس کی ترویج و ترقی کے لیے مضبوط بنیادوں پر تمام سی پی اور برار میں انجمن ترقیٔ اُردو ہند کی شاخوں کا

جال پھیلادیں۔

ان میں بعض اُمور ایسے ہیں کہ آپ آسانی سے یا تھوڑی سی کوشش سے کر سکتے ہیں۔ صرف توجہ کی ضرورت ہو اور بعض ایسے ہیں جن کے لیے بہت کچھ تگ و دو اور سعی کرنی پڑے گی۔ کام جو کرنے کے قابل ہو خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، حقیقی طور پر اسی وقت سرانجام پاتا ہو جب کہ خلوص اور مستعدی سے کیا جائے۔ اور خلوص اور مستعدی کی جلیسی کچھ اس وقت ضرورت ہو وہ آپ پر ظاہر ہو اور میرے یا کسی اور کے کہنے یا جتانے کی ضرورت نہیں۔

آپ کو معلوم ہو کہ اس سال تمام ہندُستان کی مردم شماری ہونے والی ہو۔ مردم شماری کے ساتھ زبان شماری بھی ہوتی ہو۔ زبان کے معاملے میں مردم شماری کی رپوٹ مستند سمجھی جاتی ہو۔ موافق مخالف سب اسی رپوٹ کے اعداد و شمار اپنے دعووں کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں۔ یہ بھی آپ کو معلوم ہو کہ اس معاملے میں کیسی دھاندلی اور بد دیانتی کی جاتی ہو۔ چناں چہ کمشنر مردم شماری نے خود اس کا اعتراف اپنی رپوٹ میں کیا ہو کہ "پنجاب اور یوپی میں زبان کے گوشواروں میں بلاشبہہ غلط اندراج کیے گئے ہیں۔ ہندو شمار کنندے ہر شخص کی زبان ہندی لکھتے تھے خواہ وہ شخص کوئی زبان لکھائے اور یہی حال مسلمان شمار کنندوں کا تھا۔ زبان کے معاملے میں جذبات میں بڑی شدت پیدا ہو گئی تھی، سخت بحثیں ہوتی تھیں اور ناخوشگواری انتہا کو پہنچ جاتی تھی جس کا "نتیجہ یہ ہوا کہ ہندی کی میزان پر تو کچھ اثر نہ پڑا لیکن اُردو کی میزان پر بہ نسبت سابق (سنہ ۱۹۰۱ء) کے $\frac{1}{5}$ کم ہو گئی اور اضلاع کے گوشواروں میں تو اکثر حالتوں میں یہ فرق بہت ہی بے سروپا پایا گیا۔"

(رپوٹ مردم شماری ۱۹۱۱ء صفحہ ۳۲۰)۔ آخر ان بدعنوانیوں سے تنگ آکر یہ فیصلہ کیا گیا کہ یوپی میں ہر شخص کی زبان ہندستانی لکھی جائے۔ چناں چہ ۱۹۲۱ء اور ۱۹۳۱ء کی مردم شماریوں میں اسی پر عمل کیا گیا۔

خیر اس کا مضائقہ نہ تھا لیکن مردم شماری میں اس کی بھی پابندی نہیں کی گئی بلکہ گریرسن کی من مانی تقسیم کی پیروی کی گئی یعنی مغربی ہندی اور مشرقی ہندی دو قسمیں قرار دی گئیں۔ مغربی ہندی میں ہندستانی، بانگڑو، قنوجی اور بندیلی شامل ہیں اور مشرقی ہندی میں اودھی، بگھیلی اور چھتیس گڑھی۔ اور ہندستانی میں اُردو اور ہندی دونوں ہیں۔ اب اگر کوئی چاہے کہ مردم شماری کی رپوٹ سے اُردو جاننے اور بولنے والوں کی تعداد دریافت کرے تو یہ ممکن نہیں۔ ہندی اور اُردو کا امتیاز رسم خط سے کیا گیا ہے اور اس سے صرف خواندہ اشخاص کی تعداد معلوم ہو سکتی ہے۔ ایسے اشخاص اس شمار سے خارج ہوں گے جو لکھنا پڑھنا تو نہیں جانتے لیکن زبان جانتے اور بولتے ہیں مگر افسوس یہ ہے کہ مردم شماری میں اس کا اہتمام نہیں کیا گیا۔ اگر اس کا خیال رکھا جاتا تو آسانی سے معلوم ہو جاتا کہ کتنے اشخاص ہندی لکھنا پڑھنا جانتے اور کتنے اُردو لکھ پڑھ سکتے ہیں۔ یہ اعداد صرف پنجاب، سی پی برار، سنٹرل انڈیا ایجنسی، حیدرآباد اور کشمیر کے گوشواروں میں مندرج ہیں۔ باقی صوبوں اور علاقوں نے اس کی طرف مطلق توجہ نہیں کی جس کی شکایت مردم شماری کی رپوٹ میں بھی کی گئی ہے

"کوئی شخص اپنی زبان مغربی ہندی یا مشرقی ہندی نہیں کہتا یا بتاتا۔ وہ کسی نہ کسی زبان یا بولی کا نام لیتا ہے اور اکثر صوبوں میں شمار کنندہ وہی زبان اور بولی اپنے نقشوں میں درج کرتا ہے۔ لیکن بعد میں رپوٹ مرتب کرنے

والے ان اعداد کو مغربی اور مشرقی ہندی میں تقسیم کر لیتے ہیں۔ اس طرح
ہندی، ہندستانی، اُردو سب گئیں۔ البتہ جن علاقوں کی مادری زبان ہندستانی
یا اُردو نہیں وہاں ہندستانی یا مغربی ہندی جاننے والوں کی تعداد دوسری
زبان کی حیثیت سے لکھ لی گئی ہے۔ جس کے یہ معنی ہوئے کہ ہندستان بھر میں
کسی کی بھی مادری زبان اُردو یا ہندستانی نہیں۔ مردم شماری کی رپوٹ کی
یہ ادنیٰ ستم ظریفی ہے

شمارکنندوں کی جانب داری پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے۔ یہ ہندی اُردو
تک ہی محدود نہیں بلکہ مدراس میں بنگالی اور اُڑیا اور تلنگی اور اُڑیا کے
معاملے میں بھی بڑی دھاندلی ہوئی۔ جس کی وجہ سے نگرانی کے لیے خاص افسر
مقرر کیے گئے۔ اس معاملے میں شمارکنندہ اور زبان لکھنے والا دونوں اپنی
زبان کی جانب داری کرتے ہیں اور اس طرح اعداد و شمار غلط ہو جاتے ہیں۔
مدراس کے متعلق سنہ ۱۹۰۱ء کی مردم شماری کی ایسی بے اعتباری ہوئی کہ
سنہ ۱۹۰۹ء میں مدراس گورنمنٹ نے ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی جس کی رپوٹ
سے معلوم ہوا کہ چوں کہ گورنمنٹ کی طرف سے اُڑیا والوں کی حوصلہ افزائی کی
خاطر ملازمت وغیرہ میں خاص رعایتیں ملحوظ رکھی جاتی ہیں۔ لہذا تلنگی
والوں نے اپنی زبان بھی اُڑیا لکھوا دی اور چوں کہ شمارکنندوں میں اُڑیا والوں
کی تعداد زیادہ تھی اس لیے وہ ہر کسی سے اُڑیا زبان میں پوچھ گچھ کرتے تھے
اور جس کسی نے اڑیا میں جواب دیا اس کی زبان اڑیا لکھ لی۔

پہلے ہندی اُردو کا ناگوار جھگڑا صرف یو پی میں تھا جس کا اثر مردم شماری
پر بھی پڑتا تھا۔ ناچار اس سے بچنے کے لیے یہ حکم دے دیا گیا کہ یو پی کے ہر شخص
کی زبان ہندستانی لکھی جائے۔ پوچھنے کی بھی ضرورت نہیں لیکن اب

یہ فساد ہندستان کے بعض بہی خواہ رہ نماؤں کی وجہ سے روز بہ روز بڑھتا اور پھیلتا جا رہا ہے اور سیاست کی موجودہ کش مکش نے اس میں اور شدت پیدا کر دی ہے لہٰذا اس بار مردم شماری میں بہت کچھ بدعنوانی کا اندیشہ ہے۔ گزشتہ مردم شماریوں کا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ زبان شماری کا انحصار زیادہ تر شمار کنندوں پر ہے۔ ناخواندہ تو مجبور ہیں۔ انھیں یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ شمار کنندے نے ان کی زبان کیا لکھی ہے۔ لیکن بعض اوقات خواندہ اشخاص کی زبان بھی وہ اپنے لسانی یا سیاسی رجحان کے مطابق کچھ اور لکھ دیتے۔ اس لیے مردم شماری کے وقت کم سے کم خواندہ اشخاص احتیاطاً یہ دیکھ لیں کہ شمار کنندے نے وہی زبان لکھی ہے جو انھوں نے بتائی تھی۔ کوئی اور تو نہیں لکھ دی۔ دوسرے اُردو دانوں کو مردم شماری کے کام کے لیے زیادہ تعداد میں اپنے آپ کو پیش کرنا چاہیے۔ یہ بھی ایک قومی خدمت ہے اس سے یہ ہوگا کہ زبان کے معاملے میں زیادہ دھاندلی نہیں ہونے پائے گی۔

مردم شماری کے گوشواروں میں زبان کے دو خانے ہوتے ہیں۔ ایک مادری زبان کا اور دوسرا زائد زبان کا، یعنی ایسی زبان جو مادری زبان کے علاوہ ہے۔ مثلاً اگر کسی کی مادری زبان اُردو ہے اور دوسری زبان جو وہ جانتا ہے فارسی، انگریزی یا مرہٹی ہے تو مادری زبان کے خانے میں اُردو اور دوسرے خانے میں فارسی انگریزی وغیرہ لکھی جائے گی۔ یا اگر کسی کی مادری زبان ہندی یا مرہٹی ہے اور اس کے علاوہ اُردو بھی جانتا ہے تو دوسرے خانے میں اُردو درج ہوگی۔ یہ بات بھی خوب ذہن نشین کر لینی چاہیے۔

پچھلی مردم شماری میں سی پی اور برار میں اُردو خواندہ اشخاص کی تعداد

۲۴۲۴۴، بتائی گئی تھی۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ تعداد کہاں تک صحیح ہو لیکن یہ ظاہر ہی کہ اس دس سال کے عرصے میں یہ تعداد بہت بڑھ گئی ہوگی۔ اب جو مردم شماری ہوگی اس سے اگرچہ صحیح تعداد کا معلوم ہونا تو مشکل ہی۔ تاہم ایک اندازہ ہوجائے گا کہ کتنی ترقی ہوئی ہی۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اغراض مردم شماری کے لیے خواندہ سے مراد وہ شخص ہی جو معمولی خط لکھ سکے اور خط کا جواب پڑھ سکے۔ اس لیے آپ کا فرض ہی کہ جہاں تک ممکن ہو خواندوں کی تعداد بڑھائیے۔ ابھی کافی وقت ہی۔ اگر آپ جی میں ٹھان لیں تو مردم شماری کے وقت تک ہزارہا اشخاص کو خواندہ بنا سکتے ہیں۔ لیکن یہ کام کانفرنسوں میں ریزولیوشن منظور کرنے سے نہیں ہوسکتا اس کے لیے سچے جوش، دھن اور مستعدی کی ضرورت ہی

آج کل کچھ ایسی ہوا چلی ہی کہ اُردو کے خلاف نئے نئے اور عجیب عجیب اعتراض گھڑ گھڑ کر بیان کیے جارہے ہیں اور ان کو بار بار دُہرایا جارہا ہی۔ اس لیے میں اُن پر ایک نظر ڈالنا چاہتا ہوں۔ کہا جاتا ہی کہ یہ زبان مسلمان بادشاہوں نے پھیلائی۔ گویا بادشاہ ہی تو زبانیں بناتے اور پھیلاتے ہیں۔ یہ عجیب وغریب تحقیق گاندھی جی نے کی ہے۔ یہ جملہ انھوں نے ناگ پور ہی میں بھارتیہ ساہتیہ پرشد کے اجلاس میں ارشاد فرمایا تھا۔ اب ان کے پیرو اور وہ اصحاب جن کی آنکھوں میں اُردو کانٹے کی طرح کھٹکتی ہی یہ بات لے اُڑے اور موقع بے موقع کہتے پھرتے ہیں۔ لیکن کسی نے اب تک یہ نہ بتایا کہ کون سے مسلمان بادشاہ تھے جنھوں نے یہ نیک کام انجام دیا۔ ہندوستان میں جب تک اسلامی حکومت رہی دربار اور دفتر کی زبان فارسی رہی بلکہ ہندو راجاؤں کی دفتری زبان بھی فارسی ہوگئی۔ خود بادشاہ

فارسی بولتے اور فارسی لکھتے تھے۔ البتہ دلّی میں شاہ عالم ثانی اور بہادر شاہ ظفر اُردو کے شاعر تھے۔ یہ دونوں انگریزوں کے وظیفہ خوار تھے۔ شاہ عالم کی حکومت کے متعلّق مثل مشہور ہے۔ "سلطنت شاہ عالم از دلّی تا پالم" اور ظفر صرف قلعہ معلّے کے بادشاہ تھے۔ لکھنؤ کی بادشاہت بہت تھوڑے دن رہی اور وہ بھی محدود رقبے میں۔ اُردو نے اگر ترقی کی اور سرکار دربار میں رسائی پائی تو انگریزی حکومت کی بدولت۔ اور انگریزی حکومت ہی نے فارسی زبان کو نکال کر اُردو کو دفتروں اور عدالتوں کی زبان بنایا۔ اُس وقت کسی نے یہ اعتراض نہ کیا۔

ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ یہ بدیسی زبان ہے یا مسلمانوں کی زبان ہے۔ یہ سراسر غلط اور لغو ہے اور جان بوجھ کر آنکھوں میں خاک ڈالنی ہے۔ مسلمان اسے کہاں سے لائے تھے۔ یہ خاص ہندوستان کی پیداوار اور دونوں قوموں یعنی ہندو مسلمانوں کے لسانی، تہذیبی اور معاشرتی اتحاد کا نتیجہ ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کے بنانے والے زیادہ تر ہندو ہیں۔ اگر اس میں چند فارسی عربی کے لفظ آگئے تو کیا اس سے وہ بدیسی ہو سکتی ہے۔

ایک بات یہ بھی کہی جاتی ہے کہ یہ تو درباری زبان ہے اور بادشاہوں اور نوابوں کی مصاحبت کے لیے موزوں ہے۔ بے شک یہ درباری بھی ہے اور بازاری بھی، یہ عالموں کی بھی ہے اور عامیوں کی بھی، شہریوں کی بھی ہے اور دیہاتیوں کی بھی، یہ فلسفیوں کی بھی ہے اور سائنس دانوں کی بھی، یہ فسانوں کی بھی ہے۔ اور داستانوں کی بھی۔ دفتر کی مثلوں کی بھی ہے اور قصیدوں اور غزلوں کی بھی۔ اور یہی اس کی سب سے بڑی فوقیت اور سب سے بڑی وجہ ترجیح ہے۔

ایک ایسی زبان کے لیے جو ملک بھر کی عام زبان ہونے کا دعویٰ رکھتی ہو، ضرور ہے کہ وہ

۱۔ دیسی زبان ہو، باہر کی نہ ہو۔
۲۔ کسی خاص فرقے یا رقبے تک محدود نہ ہو۔
۳۔ زمانے کا ساتھ دے سکے اور حالات کے مطابق ڈھل سکے۔
۴۔ ہر قسم کے خیالات اور جذبات کے ادا کرنے پر قادر ہو۔
۵۔ ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک کا ذریعہ بن سکے۔

اُردو زبان یہ تمام شرطیں پوری کرتی ہے۔ اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ یہ خالص دیسی زبان ہے۔ نہ کسی خاص فرقے کی ہے اور نہ کسی خاص رقبے میں محدود ہے۔ یہ ہر زمانے میں ہر قسم کی ادبی، کاروباری اور تعلیمی ضرورتیں پوری کرتی رہی ہے۔ ہر نوع کے مضامین، اعلیٰ سے اعلیٰ خیالات اور نازک سے نازک جذبات کے ادا کرنے کی قدرت رکھتی ہے۔ اس وقت ادنیٰ سے لے کر یونیورسٹی تک کی تعلیم کا ذریعہ ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آسانی سے سیکھی جا سکتی ہے۔ غیر ملکوں کے لوگ بہت کم عرصے میں سیکھ لیتے ہیں جس کی سینکڑوں شہادتیں موجود ہیں۔

اگر باوجود ان تمام اوصاف کے وہ ملک بھر کی زبان نہ ہوئی تو اس میں زبان کا قصور نہیں۔ یہ سراسر ہمارا قصور ہوگا۔ ہم کو شکر کرنا چاہیے کہ ہمیں ایک ایسی کامل اور اصلاح پذیر بنی بنائی زبان مل گئی ہے۔ اگر ہم نے اس سے کام نہ لیا اور اُس رتبے تک نہ پہنچایا جس کی وہ مستحق ہے تو اس سے بڑھ کر کوئی کفرانِ نعمت نہ ہوگا۔

اے اہلِ سی پی و برار! میں آپ کو خاص طور پر مخاطب کرنا چاہتا ہوں

اس لیے کہ اُس ناگوار سانحہ کے بعد جو ۱۹۳۶ء میں آپ کے شہر ناگ پور میں واقع ہوا آپ نے اپنی زبان کی بقا اور تحفظ کے لیے سب سے زیادہ کام کیا اور جواں مردانہ جدوجہد کی۔ آپ کے صوبے میں انجمنِ ترقیٔ اُردوٗ ہند کی شاخیں اور مدرسے بھی دوسرے مقامات سے زیادہ ہیں۔ لیکن یہ کافی نہیں۔ اب کچھ عرصے کے لیے کانفرنسیں بند، ہنگامے موقوف؛ ریزولیوشن بالائے طاق رکھیے اور قصبے قصبے اور گانو گانو پھر کر انجمن کا پیغام گھر گھر پہنچائیے۔ جہاں جہاں پہلے سے کچھ کام ہو رہا ہو اسے مضبوط کیجیے، جہاں کام سست پڑ گیا ہو اُسے چُست کیجیے۔ جہاں اب تک شروع نہیں ہوا وہاں شروع کیجیے۔ جوان بڑھ ہیں۔ انھیں اُردوٗ لکھنا پڑھنا سکھائیے جو شُدبُد ہیں ان کی استعداد بڑھانے کے لیے کتب خانے اور مطالعہ خانے کھولیے اور ایک ایسا سلسلہ قائم کر دیجیے کہ کل کو کوئی یہ نہ کہے کہ میں اُردوٗ سیکھنا چاہتا تھا لیکن اس کا کوئی ذریعہ یا سامان نہ ہونے سے محروم رہ گیا۔

اگر آپ نے یہ کر لیا تو آپ کا صوبہ سب صوبوں پر سبقت لے جائے گا۔ اور ملک بھر کے لیے روشن مثال ہوگا۔

خطبۂ صدارت شعبۂ صحافت آل انڈیا اورنٹیل کانفرنس ترویپتی (جنوبی ہند)

۲۲ مارچ ۱۹۴۰ء

ایک زمانے میں انڈین نیشنل کانگریس کے سوشل کانفرنس کا بھی سالانہ اجلاس ہوتا تھا۔ ۱۹۰۰ء کی کانفرنس کے اجلاس کے صدر جسٹس رانا ڈے تھے۔ انھوں نے اپنے خطبہ میں ہندستان گزشتہ ایک ہزار سال کی تاریخ پر تبصرہ فرمایا تھا جس میں انھوں نے مسلمانوں کی آمد اور ان کی تہذیب و تمدن کے اثرات پر جو اہلِ ہند کی معاشرت، مذہب، سیاست اور خیالات پر پڑے اور اُن فوائد پر جو اُن سے مرتب ہوئے، ایک مورخانہ اور فاضلانہ نظر ڈالی ہے۔ یہ مختصر مقالہ ہزار سالہ تاریخ کا ایک منصفانہ اور محققانہ لُبِّ لباب ہے جو فاضل مصنف کے وسیع اور گہرے مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ اس مضمون میں وہ لکھتے ہیں کہ:-

"علاوہ سرچشمۂ قوت ہونے کے، اسلامی حکومت نے سینکڑوں طریقوں سے ہندوؤں کے آداب و اطوار اور ذوق کے لطیف بنانے میں مدد دی۔ مسلمان، حکومت کے

فن کو پرانے ہندو حکم رانوں سے بہتر سمجھتے تھے۔ فنِ جنگ مسلمانوں کی آمد سے قبل نہایت ناقص تھا۔ بارود اور توپ و تفنگ کا استعمال ان کی بدولت رائج ہوا۔ بہت سی دستکاریوں اور صناعیوں میں وہ بہ قول بابر کے "جدّت و ایجاد" کو کام میں لائے۔ اُن کے نام اور ان کی اصطلاحیں جو غیر ہندو ہیں، یہ بتاتی ہیں کہ ان کی اصل بدیسی ہے۔ انھوں نے شمع، کاغذ، شیشہ، گھر کے ساز و سامان اور زین وغیرہ کو رواج دیا۔ انھوں نے موسیقی (گانے اور بجانے دونوں میں) اور طب اور ہیئت کے علم میں بہت بڑا اضافہ کیا اور ان کی تقلید میں ہندوؤں نے بھی ان دونوں علوم اور نجوم و کیمیا میں اصلاح و ترقی کی اور مسلمانوں ہی کی بدولت جغرافیہ اور تاریخ پہلی بار علم و ادب کے شعبے قرار پائے۔ انھوں نے سڑکیں، پُل، نہریں، کارواں سرائیں اور ڈاک خانے بنائے اور فنِ تعمیر کے اعلیٰ نمونے پیش کیے اور فنِ باغبانی کو ترقی دی۔ نیز ہمیں نئے پھلوں اور پھولوں سے آشنا کیا۔ نظام مال گزاری جو اکبر کے زمانے میں ٹوڈرمل نے رائج کیا تھا۔ موجودہ طریقۂ مال گزاری کی بنیاد اسی پر ہے۔ وہ تمام تجارت سمندر کے راستے دور دراز ملکوں سے کرتے تھے اور انھوں نے اہل ہند کے دل میں یہ احساس پیدا کیا کہ ہندُستان بھی آباد دنیا کا ایک حصّہ ہے اور دوسرے ممالک سے تعلق رکھتا ہے اور معاشرتی لحاظ سے

دوسروں سے منقطع نہیں - ان تمام اعتبارات سے مسلمانوں
اور ہندوؤں کی متحدہ قوتوں کا تمدن جس کے نمایندے دہلی
کے مغل تھے ، ایسی نمایاں ترقی کا حامل تھا جس کا وجود
میں آنا دسویں صدی عیسوی کے قبل ممکن نہ تھا -"[1]

"Besides the source of strength, there can be no doubt, in hundred other ways, the Mohammedon domination helped to reform the tastes and manners of the Hindus. The art of Government was better understood by the Mohammadons than by the old Hindu sovereigns. The Art of war also was singularly defective till the Mohammedons came. They brought in the use of gunpowder and artillery. In the words of Baber, they taught "Ingenuity and mechanical invention". In a number of handicrafts and arts, the very nomenclature of which being made up of non-Hindu words, shows their foreign origin.

غرض یہ اور دوسری برکات جو مسلمانوں کی بدولت ہندوؤں کو

They introduced candles, paper, glass and household furtniture and saddlery. They improved the knowledge of the people in music, instrumental and vocal, medicine and astronomy, and their example was followed by the Hindus in the improvement of both these sciences, astrology and alchemy. Geography and History were first made possible departments of knowledge and literature by their example. They made roads, post offices, acqueducts canals and caravansarais and introduced the best specimens of architecture, and improved our gardening and made us acquainted with the tastes of new fruits and flowers. The revenue system inaugurated by Todarmal in Akbar's time is the basis of the revenue system up to the present day. They carried on the entire commerce by sea with distant regions and made India feel that it was a portion of the inhabited world with relations with all and not cut off from all social intercourse.

نصیب ہوئیں یا جو ہندو مسلم اتحاد سے وجود میں آئیں جسٹس راناڈے نے
بڑی تحقیق سے اور نہایت بے لاگ طور پر بیان کی ہیں۔ لیکن ایک بات
جو خاص طور پر قابلِ ذکر تھی وہ بھول گئے۔ جسٹس راناڈے اس میں بے قصور

In all these respects, the civilisation of the united Muslim and Hindu powers, represented by the Moghals at Delhi was a distinct advance beyond what was possible before the 10th century of the Christian era".

ہیں - یہ شکایت مجھے ان تمام مورخوں سے ہے جنھوں نے ہندستان کی تاریخ پر کتابیں لکھی ہیں وہ بادشاہوں اور راجاؤں کے شجروں اور نسب ناموں، ان کی لڑائیوں اور فتوحات، ان کے درباروں اور جشنوں، ان کے جلوسوں اور تفریحوں کے حالات بڑی آب و تاب سے بیان کرتے ہیں، لیکن ذکر نہیں کرتے تو اُس چیز کا جو تاریخی اور سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی اعتبار سے ہندو مسلمانوں کے اتّحاد اور یک جہتی کی سب سے اہم اور عظیم الشان یادگار ہے - یوں تو ہماری بہت سی یادگاریں ہیں لیکن ان میں سے بعض مٹ گئیں یا مٹنے والی ہیں - بعض ایسی ہیں جنھیں لوگ بھول جائیں گے اور کچھ ایسی ہیں جو پرانے آثار کے کھوج لگانے والوں اور قدیم تاریخ کے محققوں تک رہیں گی - لیکن اُردُو زبان دونوں قوموں کی شرکت اور اتحاد، اور دونوں قوموں کی معاشرت و تہذیب کے میل کی ایسی یادگار ہے جسے زمانہ کبھی نہیں بھلا سکتا۔

وہ دو قومیں جن کی یک جہتی اِس درجے کو پہنچ گئی ہو کہ وہ دنیا میں ایک نئی زبان پیدا کر سکتی ہوں وہ کیوں کر جدا ہو سکتی ہیں؟ اس کا سارا دوس مورخوں اور ریاست دانوں یا سیاست کاروں پر ہے - مورخوں نے تاریخ کا صحیح مفہوم نہیں سمجھا - یا تو وہ اسے قصہ خوانی سمجھتے رہے یا تعصب نے ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی - سیاست داں یا سیاست کار اغراض اور ہوس طلبی یا قومیت اور اس قسم کے لئے الفاظ اور اصطلاحوں کے پھیر میں پڑ کر جدائی کے فاصلے کو بڑھاتے رہے - خدا کے ان نیک بندوں نے اس بیش بہا اور عزیز چیز کو جو باوجود اختلافات، جنگ و جدل اور انقلابات کے باقی تھی، اپنی تنگ نظری، تعصب اور نفسانیت کے نذر کر دیا - اس کے بعد یہ کہنا کہ دل بدلو "دل بدلو" ایک صدائے بے ہنگام ہے۔

میں نے یہ ذکر اس لیے چھیڑا ہے کہ آج کل ہر چھوٹی بڑی کانفرنس، انجمن، سمیلن اور سبھا اور ہر اخبار اور رسالے میں قومی زبان کا مسئلہ زیر بحث ہے اور نئے نئے نکتے اور نئے دلائل پیش کیے جا رہے ہیں۔ ساری بحث یہ ہے ہندستان کی قومی زبان ہندی ہو یا ہندستانی یا اردو۔ ان میں سے ہر زبان کا حامی اس بات کا مدعی ہے کہ اسی کی زبان قومی زبان ہونے کا حق رکھتی ہے لیکن اس ساری بحث میں غور طلب امر یہ ہے کہ کیا ایک ایسے ملک میں جہاں مختلف عناصر جمع ہیں سب کے لیے ایک زبان کا ہونا مناسب ہے؟ اور اگر ایسا ہو تو پھر وہ کون سی زبان ہونی چاہیے؟

ایک ہی زبان ہونے کا اگر یہ مطلب ہے کہ ملک میں کوئی دوسری زبان نہ رہے تو یہ دعویٰ سرے سے نامقبول اور غیر معقول ہوگا۔ اگر اس سے مراد یہ ہے کہ مقامی زبانوں کے علاوہ کوئی ایسی مشترک زبان بھی ہو جو باہم تبادلۂ خیالات، کاروبار، تعلیم وغیرہ کا ذریعہ ہو سکے تو اس کی معقولیت میں کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کوئی ایسی زبان ہے جو اس خدمت کو انجام دے سکتی ہے۔ اگر ہے تو وہ کون سی ہے۔

اس کے لیے ہمیں تھوڑی دیر کے واسطے اپنی گزشتہ تاریخ پر نظر ڈالنی پڑے گی۔ مستند اور قطعی تاریخی شہادتیں اس امر کی موجود ہیں کہ مسلمانوں کی آمد پر ہندستان کی حالت سیاسی، اقتصادی، معاشرتی، اخلاقی اعتبار سے نہایت ابتر اور درہم برہم تھی۔ طوائف الملوکی کا بازار گرم تھا۔ آپس میں نفاق اور پھوٹ تھی۔ ہر رجواڑہ خود مختار تھا۔ آمد و رفت اور رسل و رسائل کے ذرائع مفقود تھے، نہ کوئی ایک نظام تھا نہ کوئی ایک حکومت تھی، نہ ایک ملک تھا، نہ ایک قوم تھی، نہ ایک زبان تھی۔

مسلمانوں کے تسلط کے بعد اس وسیع خطے کے پریشان اجزا ایک شیرازہ میں مرتب ہو کر ایک ملک کہلائے۔ ایک نظام قائم ہوا اور ایک نئی تہذیب اور ایک نئی زبان کی بنیاد پڑی جو حقیقی ہندستانی تہذیب اور ہندستانی زبان ہے۔ یہ ایک دن کا کام نہ تھا۔ یہ صدیوں کی مسلسل محنت، سینکڑوں اعلیٰ دماغوں کی کاوش اور باہمی اختلاط، عام رواداری، میل جول اور رفاقت کا نتیجہ تھا۔ اس سے قبل ملک کی کوئی عام اور مشترک زبان نہ تھی۔ ہر علاقے کی بولی الگ اور اس کی مختلف شاخیں تھیں۔ چوں کہ مختلف علاقوں کے تعلقات ناخوشگوار یا منقطع تھے اور آمد و رفت کے وسائل بھی کافی نہ تھے اس لیے کوئی زبان ایسی بننے نہ پائی جو سارے ملک کی عام زبان ہوتی۔ جب اسلامی حکومت کو یہاں استقلال ہوا اور مسلمان یہاں مستقل بس گئے اور اس ملک کو اپنا گھر بنا لیا اور یہاں والوں سے گھل مل کر ایک ہو گئے تو لامحالہ ایک کا اثر دوسرے پر پڑا اور آپس کے ربط و ضبط سے خود بخود ایک نئی تہذیب (کلچر) اور ایک نئی زبان بنتے بنتے بن گئی جو ہم سب اہلِ ہند کا بلا امتیاز مذہب و ملت موروثی ترکہ ہے۔ یہ کوئی ارادی چیز یا کوشش نہ تھی، یہ عین فطرت کا اقتضا اور ضرورت وقت کا تقاضا تھا۔ دنیا کی تاریخ میں یہ عجیب اور حیرت انگیز واقعہ ہے۔ بہ قول ڈاکٹر تاراچند کے "سب سے بڑھ کر یہ ہے کہ ایک لسانی امتزاج وجود میں آیا۔ مسلمانوں نے اپنی ترکی اور فارسی ترک کر دی اور ہندوؤں کی زبان اختیار کر لی۔ مسلمانوں نے اپنے فنِ تعمیر اور مصوری کی طرح اس میں بھی حالات و ضروریات کے لحاظ سے ترمیم و اصلاح کی اور اس طرح ایک نئی ادبی زبان پیدا کی جو اردو ہے پھر ہندو مسلمان دونوں نے اسے اپنی زبان بنا لیا[1]"

[1] Influence of Islam on Indian Culture. p. 139.

یہ تہذیب اور زبان اُس وقت سے اب تک برابر چلی آرہی ہے اور اس سے قبل کسی نے ان کے ہندی یا ہندستانی ہونے میں شبہہ نہیں کیا تھا۔ صدیوں کی متفقہ محنت اور کوشش کو خاک میں ملاکر دو تین ہزار برس پہلے کی تہذیب اور زبان کو رائج کرنا سراسر کوتہ بینی ہے۔ کیوں کہ یہ اصلی ہندستانی تہذیب اور زبان نہیں ہوسکتی۔ اصلی ہندستانی تہذیب اور زبان وہی ہوسکتی ہے جس میں سب کے ہاتھ اور دل و دماغ لگے ہوں اور جس کی تعمیر آپس کی دل جوئی اور محبت سے ہوئی ہو۔ سر تیج بہادر سپرو نے بالکل سچ کہا ہے کہ "ہندو مسلم اتحاد کو اس سے بڑھ کر کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا کہ اُردو کو جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد سے بنی ہے مٹانے کی کوشش کی جائے اور یہ کہنا کہ اُردو ہندو مسلمانوں کا مشترکہ ترکہ نہیں ہے۔ تاریخ جھٹلانا ہے۔" سر تیج بہادر سپرو نے اس بات کو جتایا ہے جسے لوگ سیاسی گرد و غبار میں نظر انداز کر گئے ہیں۔

میں نے اس موقع پر مشترک زبان کا ذکر اس لیے چھیڑا ہے کہ اس وقت یہ نہایت اہم مسئلہ ہے۔ میرا یہ یقین ہے کہ تمام سیاسی چالیں اور حکمتیں اور سمجھوتے بے کار رہوں گے۔ اگر زبان کا مسئلہ یونہی تنگ نظری کا شکار رہا۔ اس لیے جو لوگ اپنے ملک کی بھلائی کے خواہاں ہیں انھیں اس پر غور کرنا لازم ہے اور انھیں ایک ماہر لسانیات کے اس قول کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔

"جو چیز کہ لوگوں کو ایک یعنی متحد بنائے رکھتی ہے وہ ایک عام اور مشترک زبان کے حق میں ہوتی ہے۔ جو چیز کہ ایک زبان بولنے والوں میں جدائی پیدا کرتی ہے وہ زبان میں تفریق پیدا کرنے کے حق میں ہوتی ہے۔"

لیکن ملک کی عام اور مشترک ہونے کا دعویٰ ہر بولی نہیں کر سکتی

اس کے لیے چند شرطوں کا ہونا لازم ہے اور وہ یہ ہیں :۔

۱۔ وہ زبان دیسی ہو، بدیسی نہ ہو۔

۲۔ کسی خاص فرقے یا رقبے تک محدود نہ ہو۔

۳۔ ملک کے بہت بڑے حصے میں سمجھی اور بولی جاتی ہو۔

۴۔ ہر قسم کے خیالات اور جذبات کے اداکرنے پر قادر ہو۔

۵۔ ادنیٰ سے اعلا تعلیم تک ذریعۂ تعلیم ہو سکتی ہو۔

۶۔ زمانے کا ساتھ دے سکے اور حالات کے مطابق ڈھل سکے۔

اس امر کے ثبوت کی مطلق ضرورت نہیں کہ اُردو خالص دیسی زبان ہے، باہر سے نہیں آئی اور نہ ہندستان سے باہر کسی علاقے میں رائج ہے۔ یہیں پیدا ہوئی، پلی، بڑھی اور پروان چڑھی۔

یہ بھی ظاہر ہے اور محتاجِ ثبوت نہیں کہ یہ کسی خاص فرقے کی زبان نہیں اور نہ کسی خاص رقبے میں محدود ہے۔ یہی نہیں کہ یہ شمالی ہند، سنٹرل انڈیا، سی پی میں لاکھوں کروڑوں اشخاص کی مادری زبان ہے اور ان مقامات میں ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے، بلکہ صوبہ بمبئی کے علاقے گجرات، خاندیس، کرناٹک، دھارواڑ اور صوبہ مدراس کے علاقے آندھرا، شمالی آرکاٹ، اور دوسرے اضلاع میں ہزاروں لاکھوں کی مادری زبان اُردو ہے اور ایسے لوگوں کی تعداد تو بے شمار ہے جو اُردو بولتے سمجھتے ہیں۔ غرض یہی ایک ایسی زبان ہے جو ہندستان میں تقریباً ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے بلکہ ہندستان سے باہر بھی مختلف مقامات میں سمجھی یا بولی جاتی ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے (جو اس کی فوقیت کی بین دلیل ہے) کہ اس کے بنانے اور ترقی دینے میں صرف ہندوؤں اور مسلمانوں کا ہی ہاتھ نہیں بلکہ انگریز، پارسی اور سکھ بھی

شریک ہیں۔ اور ان میں سے ہر قوم کے لوگ اُردو کے مصنّف اور شاعر گزرے ہیں اور اس وقت بھی موجود ہیں اور آپ کو یہ سُن کر حیرت ہوگی کہ تخمیناً ایک سَو یوربین یا اینگلوانڈین ایسے ہیں جو اردو کے شاعر ہوئے ہیں اور بعض ان میں سے صاحبِ دیوان ہیں۔ یہ بات ہندستان کی کسی دوسری زبان کو نصیب نہیں۔

ادنیٰ و اعلا اور ہر قسم کی تعلیم کا ذریعہ اُردو زبان آج سے نہیں تقریباً سو سال سے ہے۔ اُنیسویں صدی کی تیسری دہائی اور اس کے بعد تک بھی دہلی کالج میں تمام علوم و فنون مثلاً فلسفہ، طبیعیات، کیمیا، ہیئت، معاشیات، قانون، ریاضیات وغیرہ اُردو میں پڑھائے جاتے تھے اور ان تمام علوم پر اُردو میں بہت سی اچھی اچھی کتابیں ترجمہ اور تالیف کی گئی تھیں اور آج جامعہ عثمانیہ میں تمام علوم کی اعلیٰ تعلیم اُردو میں دی جاتی ہے۔ ہندستان کی زبانوں میں یہ شرف بھی اسی زبان کو حاصل ہے

زبان صرف بول چال ہی کے لیے نہیں ہوتی۔ انسان محض بولنے اور بڑبڑانے کی کل نہیں ہے۔ زندگی کا پھیلاؤ دُور دُور تک ہے اور اس کے شعبے اسی قدر وسیع ہیں جس قدر کہ کائنات۔ زبان زندگی کا نہایت مفید اور اہم جز ہے اور زندگی کے ہر شعبے کے ساتھ اس کا لگاؤ اس قدر گہرا ہے کہ انسانی تمدّن اور تہذیب کی ترقی جو ہم اس وقت دیکھتے ہیں، اس میں بہت کچھ اس کا دخل پایا جاتا ہے۔ اس لیے اختیار کرنے کے قابل وہی زبان ہوسکتی ہے جو تہذیب و تمدن کی ممد ہو اور ان تمام افعال و اعمال کے انجام دینے میں کارآمد ہوسکے جن کا تعلق حیاتِ انسانی سے ہے۔ اگر وہ زمانے کا ساتھ نہیں دے سکتی اور حالات زمانے کے مطابق انسانی ضروریات کو پورا

پورا نہیں کرسکتی تو ایک مقامی بولی ہوگی اور ملک کی مستند زبان ہونے کا دعوا نہیں کرسکتی۔ اس کے لیے ضرورت ہے کہ ہم اُردو زبان کی تاریخ پر نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ گزشتہ زمانے میں اس نے کیا کیا۔ اب اس کا کیا رنگ ڈھنگ ہے اور آیندہ اس سے کیا توقع ہوسکتی ہے اور ہمیں اس کے لیے کیا کرنا چاہیے۔ یہ موقع تفصیل کا نہیں لیکن اس کے کارنامے کے سمجھنے کے لیے فی الحال ایک اجمالی نظر بھی کافی ہوگی۔

یہ زبان عوام کی تھی، بول چال کی تھی۔ دلّی سے چلی اور حکومت کے لشکر، صوبہ داروں، اہلِ عملہ، پیشہ وروں اور تاجروں کے ساتھ وسط ہند، راجپوتانہ، گجرات، دکن وغیرہ میں پہنچی۔ اہلِ علم ایک مدت تک اِسے عوام کی بولی سمجھ کر حقارت سے دیکھتے رہے اور وہ علم و ادب کی سرحد میں قدم نہ رکھنے پائی۔ آج جو دُنیا کی شایستہ ترین اور علمی زبانیں کہلاتی ہیں وہ بھی ایک وقت عوام کی بولیاں تھیں اور ابتدا میں ان کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوا تھا۔ غرض عوام کی یہ بولی آپ ہی آپ ملک میں پھیلتی چلی گئی کیوں کہ فطری صلاحیت اور زمانے کے حالات، اس کی تایید میں تھے۔

سب سے پہلے درویشوں اور صوفیوں نے اس کی قدر پہچانی۔ سچّا صوفی جس طرح انسانی نفس کے پیچ و خم اور نشیب و فراز سے واقف ہوتا ہے اسی طرح وہ زمانے کا مزاج شناس بھی ہوتا ہے۔ اس کا واسطہ ہر طبقہ اور ہر قوم و ملّت کے لوگوں سے ہوتا ہے لیکن عوام سب سے زیادہ اس کے گرویدہ ہوتے ہیں اس لیے عوام کے دلوں کو موہ لینے کے لیے عوام ہی کی بولی کارگر ہوسکتی ہے۔ اس کی شہادت ہمیں آٹھویں صدی ہجری سے مسلسل ملتی ہے۔ ابتدائی صوفیا کے اقوال ہندی یا اُسی ملی جُلی زبان میں جس کی قسمت میں سارے

ہندستان کی زبان ہونا لکھا تھا ان کے ملفوظات میں جابجا ملتے ہیں جو ان کے مریدوں نے بڑے احتیاط سے محفوظ رکھے ہیں۔ مثلاً بابا فرید شکر گنج، حضرت بندہ نواز گیسو دراز، امیر خسرو، قطب عالم، شاہ عالم، سید محمد جون پوری، شیخ بہاؤالدین باجن، شیخ عبدالقدوس گنگوہی، شاہ محمد غوث گوالیاری وغیرہ انہی بزرگوں میں سے ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ ایسے صوفیا بھی گزرے ہیں جن کی مستقل تصنیفات پائی جاتی ہیں۔ جیسے شمس العشاق میرانجی، شاہ برہان الدین جانم، سید میران حسینی شاہ، قاضی محمود دریائی، شاہ علی محمد جیوگام دھنی، خوب محمد چشتی، باباشاہ حسینی وغیرہ۔ یہ آٹھویں صدی سے گیارھویں صدی تک کے بزرگ ہیں۔

ان کے کلام میں دو چار باتیں قابلِ غور ہیں جن کی بنا پر ملی جلی بولی ہندی سے ریختہ اور ریختے سے اردو ایک مستقل زبان ہوگئی۔ اوّل تو یہ کہ ان سب کا کلام فارسی رسم خط میں ہے اور یہ رسم خط شروع سے اس کے ساتھ یعنی ہندستان کی ایک بولی نئے لباس میں نئی سج دھج سے جلوہ گر ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہندی الفاظ کی بہتات ہے اور عربی فارسی بہت کم۔ جیسے

آپہیں جوگی سب جگ چیلا | آپہیں الیک ناتھ[1] رہے اکیلا
اپنی اچھیا کر چیلے تھپایا | نیکی بدی کے دو مدرے بجایا

(برہان الدین جانم سنہ ۹۹۰ھ)

ان چار مصرعوں میں صرف نیکی بدی کے دو فارسی لفظ آئے ہیں اور یہ بھی ایسے ہیں جو ہندستان کی اکثر زبانوں میں بلا تکلف استعمال ہوتے

---

[1] الکھ ناتھ

ہیں اور یہ خیال بھی نہیں آتا کہ یہ ہندی ہیں یا فارسی۔

ای دنیا کے لوگ کیڑے مکوڑے

گھیو شہد پر دوڑا تے گھوڑے

ڈو بتے بہت نکلتے تھوڑے

ان تین مصرعوں میں صرف دو لفظ یعنی دنیا اور شہد آئے ہیں۔ باقی سب ہندی ہیں اور یہ دو لفظ ایسے معمولی ہیں کہ ہر جگہ سمجھے جاتے ہیں۔ یہ دو مثالیں میں نے جان کر ایسی دی ہیں کہ ان میں فارسی عربی لفظ بھی ہیں۔ ورنہ صفحے کے صفحے پڑھ جائیے کہیں ایک لفظ بھی فارسی عربی کا نہیں آتا۔

تیسرے چوں کہ ان بزرگوں کا مقصد تلقین و تعلیم تھا۔ اس لیے ان کے کلام میں مذہبی اور صوفیانہ عربی اصطلاحوں کا آنا لازم تھا۔ لیکن ساتھ ہی وہ ہندی اور سنسکرت کے ٹھیٹھ الفاظ اور عارفانہ اصطلاحیں بھی بے تکلف استعمال کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ حمد و نعت میں بھی وہ عربی الفاظ کے ساتھ سنسکرت کے مذہبی لفظ لکھ جاتے ہیں۔ مثلاً

پانچوں وقت نماز گزارو دائم پڑھو قرآن

کھاؤ حلال بولو مکھ ساچا راکھو درست ایمان

چھوڑ جنجال جھوٹی سب مایا جن میں ہووے گیان

کلمہ شہادت مکھ بنسا رو جس سے چھوٹو ندھان

دین موتی کی نعمت پاؤ جنت راکھو شانوں

محمود مکھ تھیں تل نہ لبھاسے اپنے وجھتی کانانوں

(قاضی محمود دریائی ۹۲۰ھ)

اس میں نماز، قرآن، ایمان، دین، جنت، حلال کے لفظ تو البتہ

فارسی یا عربی ہیں اوران کا ہونا ناگزیر تھا - ورنہ باقی سب ہندی سنسکرت کے لفظ ہیں -

شاہ برہان الدین جانم کا ایک رسالہ حکمۃ الحقائق نثر میں ہے جس میں مرید کی طرف سے سوال اور مرشد کی طرف سے جواب ہوتا ہے - ایک سوال و جواب مثال کے طور پر یہاں نقل کیا جاتا ہے:-

سوال :- یہ تن الاڈھا[1] دستاں، ولیکن جلیتا بکار[2]
ٹوٹنے نہیں بلکہ ستتنتر[3] بکار روپ
دستا ہے یا ٹک نل قرار نہیں، جیوں
مرکٹ[4] روپ

جواب :- ای عارف ظاہر تن کے فعل
سوں گزریا و باطن کر تپ دستے،
اس کا ناؤں سو ممکن الوجود، دوسرا
تن سو بھی کہ اس کا ایندرائی کا
بکار و چیتا کر اسود ہی تن،
نہیں یو خاک و سوکھ دوکھ بھوگن ہارا
جیا بکار روپ دہی دوسرا تن
تو تو نظر کر دیکھ، یہ تن فہم سوں
گزریا تو گن اس کا کیوں رہے

اس مثال میں دیکھیے چند عربی لفظوں کے ساتھ کس قدر ہندی لفظ

---

[1] علاحدہ [2] تغیر [3] قلب ماہیت [4] بندر [5] حواس

اور سنسکرت کی اصطلاحیں آئی ہیں

چوتھے ان نظموں کی بحریں سب ہندی ہیں اور بیان کا اسلوب، کلام کا رنگ، نیز استعارات و تشبیہات بھی زیادہ تر ہندی ہیں مثلاً ان کے یہاں بھی ہندی شعرا کی طرح عورت ہی عاشق ہے اور خدا یا گرو معشوق۔ یہ بعض اوقات تصوّف اور معرفت کی باتیں عورت سے خطاب کرکے یا عورت کے حالات میں بیان کرتے ہیں۔ جیسے یہ دنیا سسرال ہے اور عالم آخرت اس کا میکا ہے اور اس طرح بہ طور استعارہ عورتوں کے تمام مناسبات مثلاً زیور پہننا، مہدی لگانا، چرخہ کاتنا وغیرہ استعمال کرتے ہیں دو ایک مثالیں یہاں بھی لکھی جاتی ہیں :-

نا میں کیتی بندگی تیری نا دھر کیتی یاد
دائم کیتی آگل تیرے سلگوں تھے فریاد
تیں بھی میرا لاڑ چلایا کبھو نہ ہوا اُداس
آپ سند لیا نوڑ گسائیں تیری منجھ آس

(میرانجی سنہ وفات ۹۰۲ھ)

نیہہ کا پینا مجھ لو لاگا   لوگ دیوانی دیکھ ہنسیں
جگ کی ہانسیں کیا مجھ ہوئے   کہو سر یجن کہاں بسیں

(جانم)

دکھ جیو کا کس سے کہوں اللہ دکھ بھریا سب کوئی رے
بن دکھی جگ میں کو نہیں میں پرکھی پھر پھر جوئی رے

(قاضی محمود)

نینوں[1] کاجل مکھ تبنولا ناک موتی گل ہار
سیر نماؤں نیہہ اپاؤں اپنے پیر کروں جوہار
(قاضی محمود)

پانچویں، ایک بات ان کے کلام میں یہ پائی جاتی ہے کہ عربی، فارسی یا ہندی کے لفظ وہ اس طرح لکھتے ہیں جو عوام کی زبان پر تھے۔ اصل کی طرف رجوع نہیں کرتے تھے۔ بات یہ ہے کہ وہ عربی فارسی کے لفظ نہیں رہے تھے۔ بلکہ اسی زبان کے لفظ ہو گئے تھے جو عام طور پر بولی جاتی تھی۔ مثلاً علیحدہ کو 'الادھا'، وضع اور نفع کو 'وضا' اور 'نفا' بعدازاں کو 'بزاں'، شروع کو 'شرو' وغیرہ وغیرہ۔ یہ نہیں کہ وہ جاہل تھے۔ صاحب علم لوگ تھے۔ مگر وہ جانتے تھے کہ جس زبان میں وہ لکھ رہے ہیں وہ فارسی عربی نہیں بلکہ ایک دیسی زبان ہے اور وہ لفظ خواہ اصل میں عربی کے ہوں یا فارسی کے اب تبدیلِ ہئیت کے ساتھ اس دیسی زبان کے ہو گئے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ فلسفۂ زبان اور اصول لسانیات پر ان کی کس قدر نظر تھی۔

ان بزرگوں کا کلام سب نظم میں ہے اور خال خال نثر میں۔ مولیر کے ایک کیرکٹر کو یہ معلوم کر کے بہت حیرت ہوئی تھی کہ وہ چالیس سال سے نثر بول رہا ہے اور اسے خبر تک نہ ہوئی۔ لیکن اگر زبان کے ارتقا کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انسان ہزاروں سال تک نظم میں باتیں کرتا رہا اور اسے خبر نہ ہوئی۔ اس کے آثار اب تک نثر میں موجود

---

[1] یعنی آنکھوں میں کاجل، منہ میں پان، ناک میں موتی، گلے میں ہار اس سج دھج سے میں سر جھکاؤں، محبت کروں اور اپنے پیر کو آداب کروں۔

ہیں اور بغیر اس کے نثر وجود میں نہیں آسکتی۔

اسی زمانے میں جس کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے دوسرے شعرا نے جنھیں اپنے جذبات کے اظہار کا اس سے بہتر موقع نہیں مل سکتا تھا۔ اس زبان کو بڑے چاؤ سے اختیار کیا۔ سب سے پہلا مرتب و منضبط کلیات ہمیں سلطان محمد قلی قطب شاہ بادشاہ گول کنڈہ کا ملتا ہے۔ اس کا سنہ تخت نشینی ۹۹۰ ہجری ہے۔ اس کا کلام بہت ضخیم ہے۔ علاوہ غزلوں، قصیدوں، مثنویوں، قطعوں، رباعیوں، نوحوں، نعت، منقبت وغیرہ کے اس نے مقامی عمارتوں پھلوں، پھولوں، تہواروں، میلوں اور دوسرے مضامین پر متعدد نظمیں لکھی ہیں۔ اس کے بعد شاعروں کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ان میں سے بعض (خصوصاً نصرتی) کا تخیل اور قوتِ بیان حیرت انگیز ہے۔ انسانی جذبات، مناظرِ قدرت، رزم و بزم کے معرکے، اخلاقی نکات صوفیانہ اسرار، عاشقانہ راز و نیاز وغیرہ مضامین پر جب ان کا کلام پڑھتے ہیں تو یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ انھوں نے اس ابتدائی زمانے میں جذبات وخیالات کے اظہار میں کس قدر ترقی کرلی تھی۔ ایک عجیب بات یہ ہے کہ ابتدا میں جس زبان کو وطن میں کسی نے نہ پوچھا پردیس میں اس کی ایسی قدر ہوئی کہ اس میں بلا مبالغہ سینکڑوں بہت اچھے اور بعض بے مثل شاعر اور ادیب پیدا ہو گئے اور وہ وہ چیزیں لکھ گئے جو آج بھی قابلِ قدر ہیں۔ خصوصاً اس زمانے کی بعض رزمیہ مثنویاں اس پایہ کی ہیں کہ اردو زبان کو اپنے عروج میں بھی نصیب نہ ہوئیں۔ اردو زبان کے ارتقا کے لیے ان کا مطالعہ ضروری ہے۔

ان شعرا کے کلام میں بھی زبان کی وہی خصوصیتیں پائی جاتی ہیں جن کا ذکر میں صوفی شعرا کے ضمن میں کر چکا ہوں۔ البتہ اتنا تغیر ضرور ہوا کہ مثنویوں،

قصیدوں، رباعیوں، قطعوں میں انھوں نے فارسی بحریں اختیار کرلیں اور غزلوں میں ہندی، فارسی دونوں قسم کی بحریں ہیں۔ فارسی زیادہ ہندی کم۔ باقی اور خصوصیتیں وہی رہیں۔ فارسی کا زیادہ دخل ولی کے وقت سے شروع ہوا۔ ایسا کیوں ہوا؟

اس سوال کے جواب میں یہ کہا جاتا ہے کہ جب ولی دلی آئے تو شاہ سعد اللہ گلشن نے انھیں یہ ہدایت کی کہ "یہ اتنے سارے فارسی مضامین جو بے کار پڑے ہیں ان کو اپنے ریختے میں کام میں لاؤ۔ تم سے کون مواخذہ کرے گا۔" یہ روایت ممکن ہے صحیح ہو، اور غالباً صحیح ہوگی لیکن صرف اتنی سی بات زبان میں اس بڑے تغیر کا باعث نہیں ہوسکتی۔ اس کی اور وجوہ بھی ہیں۔

یہ زبان جسے ہم دلی کی زبان کہتے ہیں۔ صوفیوں اور درویشوں اور محمد تغلق کے ساتھ گجرات اور دکن میں آئی۔ محمد تغلق نے جب دولت آباد کو ہندستان کا دارالحکومت بنایا تو سارے دلی کو وہاں لا بسایا اور ہر پیشہ اور ہر فن کے لوگ وہاں آباد ہوگئے اور ان کے ساتھ یہ زبان بھی وہاں پہنچی اور ایسی پہنچی کہ کچھ دنوں کے بعد ادب و انشا کی مالک بن گئی۔ اور شمال پر جو اس کا مولد و منشا تھا، فوقیت لے گئی۔ لیکن محمد تغلق کے بعد جنوب کا تعلق شمال سے منقطع ہوگیا اور یہاں خود مختار حکومت قائم ہوگئی۔ اس کا اثر زبان پر یہ پڑا کہ اس میں کچھ زیادہ تغیر و تبدل نہ ہونے پایا۔ اتنا تغیر تو ضرور ہوا جو کسی زبان کے ایک مقام سے دوسرے مقام تک جانے سے ہوتا ہے۔ مثلاً تلفظ کی وجہ سے الفاظ کی ہیئت بدل گئی۔ رسم خط میں ذرا ظہور فرق آگیا، بعض مقامی الفاظ داخل ہوگئے۔ یا شعرا نے اظہار خیال کی ضرورت سے کچھ فارسی عربی یا مقامی لفظوں سے کام لیا۔ باقی اس کا رنگ ڈھنگ اور اسلوب

وہی رہا جو اصل دہلوی زبان کا تھا۔ شمال کی حالت اس سے مختلف تھی۔ وہاں فارسی چھائی ہوئی تھی۔ مکتبوں اور مدرسوں میں، دربار اور دفتروں میں۔ خط و کتابت اور تالیف و تصنیف میں فارسی ہی کا چلن تھا۔ ہندو مسلمان دونوں کی حالت یکساں تھی۔ ہندوؤں نے تو اس کے حاصل کرنے میں بڑا کمال دکھایا۔ ان میں فارسی کے ایسے فاضل ادیب اور شاعر گزرے ہیں کہ ان کی بعض تصانیف اب تک مستند سمجھی جاتی ہیں اور مدتوں داخلِ نصاب رہیں۔ متواتر مطالعہ، مشقِ شعر و سخن، روزمرہ کی نوشت و خواند، صحبت اہلِ علم، نیز اس وقت کے ماحول اور رواج کی وجہ سے فارسی ان کے دل و دماغ میں رچ گئی تھی اور تقریباً ان کی اپنی زبان ہوگئی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے اس زبان میں جو دو قوموں یعنی ہندو مسلمانوں اور دو زبانوں یعنی ہندی فارسی کے میل سے بن رہی تھی، بے دھڑک فارسی لفظ داخل کرنے شروع کر دیے۔ یہ ایک نفسیاتی مسئلہ ہے اس کے متعلق میں اپنے ایک صدارتی خطبے میں جو میں نے اسی کانفرنس کے ایک اجلاس میں پڑھا تھا۔ کافی بحث کر چکا ہوں[1]۔ یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت سمجھتا۔ غرض کہ زبان

---

[1] جب کبھی ہم غیر زبان سیکھنے یا بولنے کی کوشش کرتے ہیں تو اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ ہماری اپنی زبان کا کوئی لفظ نہ آنے پائے۔ ہماری کوشش یہ ہوتی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ہم اس زبان (یعنی غیر زبان) کو صحیح اور فصیح بولیں اور اس بات کی سخت احتیاط کرتے ہیں کہ ہماری گفتگو میں ہماری زبان کے الفاظ یا طرزِ ادا کا شائبہ نہ پایا جائے۔ مگر غیر زبان کے بولنے میں ہم جس بات سے اس قدر پرہیز کرتے ہیں اس کا ہم اپنی زبان میں خیال نہیں کرتے۔ مثلاً انگریزی کا آج کل

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۱ پر)

تو نہیں بدلی، وہی رہی جو تھی، لیکن اس پر فارسی رنگ چڑھنا شروع ہو گیا اور ہندی کی بعض خصوصیات کم ہو گئیں اور اب ہندی فارسی کی مساوات ہو گئی۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۰) ہمارے ہاں عام رواج ہے جب کوئی ہندستانی انگریزی بولتا ہے تو اپنی گفتگو میں حتی الامکان کبھی اپنی زبان کا لفظ نہیں آنے دیتا اور جہاں تک ہو سکتا ہے اہل زبان کی تقلید کرتا ہے اور یہی نہیں بلکہ انگریزی لب ولہجہ کی نقل اتارنے کی کوشش کرتا ہے برخلاف اس کے اپنی زبان میں گفتگو کرتے وقت بیسیوں انگریزی لفظ بلا تکلف استعمال کر جاتا ہے۔ یا تو اس سے اپنی مشیخت اور علمی فضیلت جتانی مقصود ہوتی یا پھر وہ ناواقفیت یا کاہلی کی وجہ سے ایسا کرتا ہے۔ کاہلی ان معنوں میں کہ اسے اتنی توفیق نہیں ہوتی کہ اپنی زبان میں ان کے مترادف الفاظ تلاش کرے۔ اس میں وہ کسی قدر مجبور بھی ہے۔ فاتح قوم کی زبان کے مطالعہ، لکھنے، بولنے اور سننے سے معمولی اور عام ضرورت کے لفظ بھی اس کی زبان پر اس طرح چڑھ جاتے ہیں کہ بلا ارادہ بھی اپنی زبان میں انھیں بول جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک وجہ اور بھی ہے۔ وہ بعض حالات میں غیر زبان (یعنی فاتح قوم کی زبان) کے خاص خاص الفاظ اس لیے بھی استعمال کرتا ہے کہ اس کے خیال میں (اور یہ ایک حد تک صحیح بھی ہے) ان لفظوں کے استعمال سے وہ اپنا مفہوم زیادہ خوبی اور قوت کے ساتھ سامعین کے دلنشین کر سکتا ہے۔ حالانکہ اسے علم ہے کہ ان الفاظ کے مترادف اس کی زبان میں موجود ہیں مگر وہ انھیں استعمال نہیں کرتا، اس لیے کہ وہ جانتا ہو کہ ان سے کلام میں وہ زور پیدا نہیں ہوتا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ تیس چالیس برس پہلے سوسائٹی، فارم، پولیٹیکل، سیلف، ریسپکٹ وغیرہ وغیرہ الفاظ ہماری زبان میں عام تھے۔ ان کے استعمال

(بقیہ صفحہ ۴۲ پر)

جنوب میں یہ حالت نہ تھی۔ فارسی کا وہاں بہت کم رواج تھا۔ جنوبی ہند کی زبانوں سے اس کا کوئی میل نہ تھا اور نہ وہاں ہندو تعلیم یافتہ صاحبِ ذوق جیسے لوگوں کی کوئی جماعت تھی جو اس کا رُخ فارسی کی طرف موڑ دیتی۔ اس کے علاوہ جنوب کا سیاسی تعلق شمال سے بالکل منقطع ہو چکا تھا اس لیے اس نومولود زبان میں کوئی خاص تغیّر نہ ہونے پایا۔ اکبر اور جہانگیر کے عہد میں دکن سے پھر چھیڑ چھاڑ شروع ہوئی۔ اس کا اثر تھوڑا بہت کچھ ہوا تو صرف گجرات کی حد تک۔ باقی دکن میں صرف جنگی چپقلشیں رہیں اور وہاں کی زندگی میں کوئی فرق نہ آیا۔ البتہ شاہ جہاں کے زمانے میں جب اورنگ زیب دکن کے صوبے دار مقرر ہوئے اور انھوں نے اورنگ آباد کو اپنا صدر مقام بنایا تو سرزمینِ دکن میں بہار آگئی اور ایک جگت گزرنے پر محمد تغلق کے بعد پھر اس کے دن پھرے۔ اورنگ زیب کے ساتھ اس کا جرار لشکر، فوجی اور ملکی عمال اور مختلف دفتر اور کارخانے تھے۔ ہندوستان کے راجا مہاراجا جن کے محلات کے کھنڈر اب تک موجود ہیں وہاں آکر رہتے تھے، اور ان کے ساتھ ان کا لاؤ لشکر بھی ہوتا تھا۔ لکھا ہے کہ اس وقت اورنگ آباد

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۱) کرنے والے سب کے سب ان کے مترادف الفاظ سے ناواقف نہ تھے۔ لیکن وہ جانتے تھے کہ اپنے الفاظ سے پورا مفہوم جو وہ چاہتے ہیں اور جو انگریزی الفاظ میں موجود ہے ادا نہ ہوگا۔ اب جو ہم ان کی جگہ اپنے لفظ استعمال کرنے لگے تو رفتہ رفتہ ان میں بھی وہی کس بل پیدا ہو گیا۔ ان سب باتوں سے غیر زبان (یا فاتح قوم کی زبان) کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ فضیلت بھی کئی قسم کی ہوتی ہے لیکن طوالت کے خوف سے میں اس موضوع پر یہاں بحث نہیں کروں گا۔

کی آبادی تخمیناً پندرہ لاکھ تھی۔ اب پھر شمال اور دکن کا تعلق ہو گیا۔ اس سے جہاں معاشرت کے دوسرے شعبوں پر اثر پڑا، وہاں زبان کو بھی فائدہ پہنچا۔ بعض تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ شمالی ہند کے شعرا کا کلام دکن میں آتا تھا تو لوگ بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔ اورنگ آباد کے اس وقت کے شاعر اور ادیب اپنی زبان کو دکھنی نہیں کہتے تھے بلکہ شمالی ہند سے منسوب کرتے تھے اور حقیقت یہ ہے کہ اورنگ آباد اور حیدرآباد کے لب و لہجے اور زبان میں بہت فرق ہے۔ گول گنڈہ کی فتح کے بعد یہ تعلّق اور بڑھ گیا۔ اس کے بعد نظام الملک دکن کے صوبے دار اور فرماں روا ہوئے۔ یہ بھی شمال سے آئے تھے اور ان کے ساتھ ایک بڑی جماعت ہندو مسلمان اُمرا و اہل فوج کی آئی۔ یہ خود اُردو فارسی کے بہت اچھے شاعر تھے اور اہل علم کے سرپرست تھے۔ خاندان آصفیہ اب تک علم اور اہلِ علم کی بے نظیر سرپرستی کر رہا ہے۔

ادھر مدراس میں خاندان والا جاہی نے بڑے بڑے عالم فاضل اور اُردو فارسی کے ادیب اور شاعر شمالی ہند اور دوسرے مقامات سے بلا کر اپنے دربار میں جمع کیے اور وہاں اہلِ علم کا بڑا اچھّا مجمع ہو گیا اور شب و روز شعر و سخن اور علم و فضل کا چرچا رہنے لگا۔

رفتہ رفتہ جب ایسٹ انڈیا کمپنی کا تسلط بڑھنے لگا اور تجارت کے ساتھ ملک داری کی ذمے داری بھی اسی کے سر آ پڑی تو یہ محسوس ہوا کہ ملکی زبان کے بغیر کام چلنا دشوار ہے۔ چناں چہ ان نوجوان انگریزوں کے لیے جو ولایت سے کمپنی کی ملازمت کے واسطے انتخاب کر کے بھیجے جاتے تھے اُردو (جسے وہ ہندستانی کہتے تھے) سکھانے کی تجویز کی گئی۔ اس غرض کے لیے کلکتہ میں

فورٹ ولیم کالج قائم ہوا۔ اچھے اچھے قابل اُردو داں اصحاب کو ملازم رکھا گیا اور ان سے تاریخ، اخلاق، معاشرت، قصّے کہانیوں کی کتابیں سادہ اُردو نثر میں ترجمہ کرائی گئیں۔ اُردو اساتذہ کا کلام چھپوایا گیا یا انتخاب شائع کیا گیا۔ ان کتابوں میں سے اب بھی بعض اپنی زبان کی فصاحت اور شیرینی کی وجہ سے پڑھنے کے قابل ہیں۔ ایک بڑا کام اس کالج نے یہ کیا کہ اُردو نستعلیق ٹائپ بنوایا اور اپنی کتابیں اس میں چھپوائیں۔ افسوس کہ یہ کالج کمپنی کے ڈائرکٹروں کی مخالفت کی وجہ سے قائم نہ رہ سکا۔ اس میں کچھ شبہہ نہیں کہ جدید اُردو نثر کی بنیاد یہیں پڑی۔

جو کام فورٹ ولیم کالج سے ادھورا رہ گیا تھا اور جو غالباً وہ قائم رہ کر بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے کہ اس کا مقصد محدود تھا، وہ دلّی کالج نے کیا۔ اس کالج کا بڑا کام اور بڑا احسان یہ ہے کہ سب سے اول اس نے اُردو زبان کے ذریعے سے جدید و قدیم علوم کی تعلیم کا انتظام کیا اور اس میں کامیاب ہوا۔ اور مختلف علوم پر اُردو زبان میں بہت سی کتابیں ترجمہ یا تالیف کرائیں۔ اور جس چیز کو لوگ کچھ دنوں پہلے تک محال سمجھتے تھے، وہ اس نے بڑی خوبی سے کر دکھایا۔ ۵۷ء کی شورش سے اور جو نقصان ملک کو پہنچے ہوں سو پہنچے ہوں لیکن سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ اس کالج کا خاتمہ ہو گیا جو اپنی نوعیت کا ایک تھا اور وہ کام کر رہا تھا جو اس کے بعد بڑے بڑے کالج اور یونیورسٹیاں بھی نہ کر سکیں اگر وہ قائم رہتا اور حسب ضرورت اس کے ترقی کے سامان مہیا کیے جاتے تو آج اُردو زبان کہاں سے کہاں پہنچ جاتی اس نے سچا علمی ذوق اور روشن خیالی پھیلانے میں جو کام کیا وہ اس سے ظاہر ہے کہ اس نامراد ادارے سے ماسٹر رام چندر، محمد حسین آزاد، نذیر احمد

ذکاء اللہ جیسے لوگ نکلے جنھوں نے اپنے خیالات اور قلم کے زور سے اُردو زبان کی کایا پلٹ دی لیکن کس قدر شرم کی بات ہے کہ آج دہلی یونی ورسٹی اور اس کے کالجوں میں اسے باریابی کا موقع نہیں یعنی خود اپنے گھر میں اجنبی ہے۔

اسی زمانے میں ۱۸۳۷ء کے لگ بھگ دفتروں اور عدالتوں سے فارسی زبان خارج کی گئی اور اُردو زبان اس کی قائم مقام ہوئی۔ یہ بھی اس بات کا بین ثبوت ہے کہ اُردو ہی ہندستان کی عام زبان تسلیم کی گئی۔ دوسری کوئی زبان ایسی نہ تھی جو اس منصب کے قابل سمجھی جاتی۔

اس کے بعد ڈاکٹر لائٹنر کی بدولت بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ان کی سینہ زوری سے لاہور میں اورنٹیل کالج قائم ہوا۔ اس نے قابلِ قدر کام کیا۔ اور کر رہا ہے اور اب تک مشرقی زبانوں نیز اُردو کی خدمت میں مصروف ہے اس ادارے سے بھی علمی کتابیں اُردو میں شایع ہوئیں یہ سب کچھ سہی مگر وہ کام نہ ہو سکا جو دلی کالج کر رہا تھا۔

اِدھر سر سیّد احمد خاں نے علی گڑھ سائنٹفک سوسائٹی بڑے شوق اور جوش سے قائم کی۔ لوگوں کو گھیر گھیر کر ممبر بنایا۔ چندہ جمع کیا۔ سوسائٹی کی عمارت بنائی۔ علمی لکچروں کا سلسلہ قائم کیا۔ خود لکچر دیے۔ اور پنڈت دھرم نرائن اور منشی ذکاء اللہ جیسے لوگوں سے علمی کتابوں کے ترجمے کرائے۔ اور مختلف موضوعوں پر کتابیں اور رسالے لکھوائے۔ اور بڑی بات یہ ہے کہ ٹائپ کو رواج دیا۔ ان کی ساری کتابیں، رسالے اور اخبار آخر تک ٹائپ میں چھپا کیے۔ ان کے رسالہ تہذیب الاخلاق نے نہ صرف خیالات کے بدلنے میں بلکہ اُردو طرزِ تحریر میں متانت اور پختگی پیدا کرنے میں بڑی مدد دی۔

خود سرسید کا اُردو زبان پر بڑا احسان ہے، علمی، اخلاقی، سیاسی مضامین کو سنجیدگی کے ساتھ سلیس اور فصیح زبان میں ادا کرنے کا جو ڈول انھوں نے ڈالا تھا وہ بہت مقبول ہوا اور برابر ترقی کرتا رہا۔

یہ تو خیر بڑے اور مشہور ادارے تھے لیکن علاوہ ان کے اس زمانے میں مختلف مقامات مثلاً مرزا پور، لکھنؤ، مرشد آباد، بمبئی، کلکتہ وغیرہ سے بہت سی کتابیں اُردو میں شایع ہوتی رہیں جن میں سے اکثر علمی اور مذہبی تھیں۔ لیتھو کے بہت سے اچھے مطبع قائم ہو گئے تھے اور انھوں نے اُردو کی بڑی خدمت انجام دی۔ عیسائی مشنریوں نے بھی اُردو میں کثرت سے کتابیں اور رسالے شایع کیے۔

شعر اُردو کی گھٹی میں پڑا ہے۔ ایک طرف ہندی نے اور دوسری طرف فارسی نے اس کے لیے اپنے خزانے کھول رکھے تھے۔ اس نے بھی بلا تامل دونوں کے سرمایے سے فیض حاصل کیا اور اسی میں اس کی وسعت و قوت کا راز ہے اُردو میں اور فارسی ہندی میں بھی، شعر وہ ہے جس کی چوٹ دل پر جا کر لگے اور تڑپا دے۔ ہماری شاعری دل کی شاعری ہے۔ یہ نہیں کہ اس میں دماغی اور ذہنی کیفیت کے شعر ہیں ہی نہیں۔ لیکن ان کی حیثیت ضمنی اور ثانوی ہے۔ اس نظر سے اُردو کی شاعری کسی شاعری سے کم نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ایک زمانہ ہماری شاعری پر ایسا آیا تھا کہ ظاہری تکلفات، رعایت لفظی اور صنایع بدایع نے اس کے باطن کو کچل کر رکھ دیا تھا اور شاعری ایک کھیل اور لفظوں کا گورکھ دھندا ہو کر رہ گئی تھی۔ لیکن یہ ایک عارضی دور تھا اور جلد گزر گیا۔ غالب کی آمد نے ایک نیا رنگ پیدا کیا۔ اگرچہ اس نے قدیم شاعری سے الگ ہو کر کوئی نئی راہ نہیں نکالی۔ لیکن اس کی

جدّتِ فکر، بلندیٔ تخیل اور بیان کی شوخی اور تیکھے پن نے اس میں از سرِ نو جان ڈال دی۔ اس کی شاعری میں دل اور دماغ دونوں کا سامان موجود ہے۔

اس کے بعد زمانہ بدلتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ہمارا ادب بھی بدل جاتا ہے۔ حالی نے آکر ہماری شاعری کا رُخ یکسر بدل دیا اور اپنے کلام سے ثابت کردیا کہ شعر کہیں بند نہیں ہے۔ وہ اسی قدر وسیع ہے جس قدر کہ زندگی۔ حالی نے صرف اُردو شاعری ہی پر احسان نہیں کیا بلکہ اُردو نثر کو بھی درجۂ کمال تک پہنچادیا اور اس میں ایسی پختگی، متانت اور وسعت پیدا کردی جو اس سے پہلے اسے کبھی نصیب نہ ہوئی تھی۔ حالی کا ہماری نظم و نثر پر اس قدر قوی اثر ہے کہ اس کا اندازہ اس وقت مشکل ہے۔ چکبست نے اسی رستے پر قدم اٹھایا اور تنگ کوچے سے نکل کر زندگی کے وسیع میدان پر نظر ڈالی۔ آخر میں اقبال نے اپنی قوتِ بیان، پرزور تخیل اور افکارِ جدید سے اس کو رتبہ اور بلند کردیا۔ سرسید، حالی اور نذیر احمد اس زبان کے بنانے والے ہیں۔ دوسروں نے اسے بڑھایا اور سنوارا مگر انھوں نے اسے بنایا۔

ان سب جانکاہیوں اور کوششوں سے ہماری زبان اب اس نوبت پر ہے کہ وہ ہر قسم کے خیالات اور جذبات کے اظہار پر قادر ہے۔ موجودہ اور آیندہ نسلوں کے لیے ہر طرف راہیں کھلی ہوئی ہیں اور وہ اس بے بہا سرمایہ سے فائدہ اٹھاکر ادب کے نئے کوچوں میں قدم رکھ سکتے ہیں۔

ہمیں اپنی زبان اور ادب سے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ کثرت سے اخبار اور رسالے شائع ہورہے ہیں۔ اگرچہ اچھے اخبار کی اب بھی ضرورت ہے۔ بعض رسالے ادبی تنقید اور محققانہ مضامین سے اُردو کی اچھی خدمت کررہے ہیں اور بعض خاص خاص موضوع کے لیے وقف ہیں۔ عام طور پر

لوگوں کو اُردو پڑھنے لکھنے کا شوق پیدا ہو جاتا ہے۔ نئے نئے مضامین اور علوم پر کتابیں لکھی جا رہی ہیں۔ نئے ادب والے اپنے خیالات کی اشاعت افسانوں کے پیرایے میں کر رہے ہیں۔ اگرچہ ادب میں نیا پُرانا کوئی چیز نہیں۔ جب کلام میں تازگی، جدّت اور خیالات کی گہرائی ہے وہ ہمیشہ نیا ہے گو وہ دو ہزار سال پہلے کا لکھا ہوا کیوں نہ ہو اور جس میں یہ نہیں وہ پُرانا ہے۔ گو وہ آج ہی کی تصنیف کیوں نہ ہو۔ ایک خوشی کی بات یہ ہے کہ اب عورتیں بھی اس طرف پہلے سے زیادہ توجہ کر رہی ہیں اور یہ اردو کے لیے نیک فال ہے۔ یہ زبان انھی کی ہے۔ وہ اس کی ترقی میں شریک ہوں گی تو اس کی ترقی میں کوئی شک وشبہہ نہیں ہو سکتا۔ انجمنِ ترقی اُردو (ہند) نے اپنی کوششوں سے اسے اور وسیع اور قوی کر دیا ہے اور اس کی بعض شاخیں بڑی مستعدی سے اس کی مدد کر رہی ہیں۔ ہندستان کی تقریباً تمام یونی ورسٹیوں میں اُردو کی اہمیت تسلیم کی جا چکی ہے اس بارے میں . . . . پنجاب یونی ورسٹی اور اس سے بڑھ کر مدراس یونیورسٹی ہمارے شکریے کی مستحق ہے۔

آخر میں چند لفظ جامعہ عثمانیہ کی نسبت کہنا چاہتا ہوں کیوں کہ اُردو زبان کا کوئی ذکر اس کے بیان سے خالی نہیں ہو سکتا۔ جامعہ عثمانیہ نے اُردو کو یونی ورسٹی کی اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بنا کر اور علوم وفنون پر سینکڑوں کتابیں ترجمہ اور تالیف کرا کر اُردو زبان کی بنیادوں کو ایسا مضبوط کر دیا ہے کہ زمانے کے حوادث اسے ہلا نہیں سکتے۔ لیکن جس بات سے مجھے خاص مسرت ہے وہ یہ ہے کہ اس یونی ورسٹی کے پروفیسروں میں ایک مختصر جماعت ایسی بھی ہے جو علاوہ اپنے فرائضِ منصبی کے اور بلا خیال ذاتی مفاد اور شہرت کے زبان اور علم کی بے بہا خدمت کر رہی ہے۔ جس کی قدر اس وقت تو کیا ہو گی لیکن

ایک زمانہ آئے گا کہ قدر شناس اس کی قدر کریں گے۔

جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ ان حالات میں ہمیں مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم مطمئن ہو کر بیٹھ رہیں۔ انسان کتنی بھی ترقی کر جائے، ترقی و اصلاح کی پھر بھی گنجایش باقی رہتی ہے۔ دنیا میں ہر چیز بنتی بگڑتی، ڈھلتی اور بڑھتی ہے۔ زبان بنتی بھی ہے اور بنائی بھی جاتی ہے۔ جس طرح ہم حیات کو جکڑ بند نہیں کر سکتے۔ اسی طرح زبان کو بھی مقید نہیں کر سکتے۔ یہ اس کے لیے موت ہے۔ آیندہ کی ترقی اور موجودہ اصلاح پر ہمیں ہمیشہ نظر رکھنی چاہیے۔ مثلاً اس وقت ضرورت ہے کہ ہم رسم خط کی اصلاح کریں۔ فضولیات خارج کر دیں۔ اختلافی مسائل کا حل ڈھونڈ نکالیں، مناسب ٹائپ کو رواج دیں۔ اور اس کے ساتھ ہی ہمیں ایسے لکھنے والوں کی بھی ضرورت ہے کہ جو جدید علوم کے ذخیرے کو چھانیں۔ کام کی چیزیں انتخاب کریں۔ تالیف و تصنیف کریں مگر اس ڈھنگ سے کہ بیان میں گنجلک نہ ہو اور پیچیدہ ترکیبوں اور غیر ضروری اصطلاحوں سے پاک ہو۔ نئے خیالات، زندگی کے نئے نظریوں اور نئے جذبات کے لیے ہمیں نئے الفاظ اور جملے، نئے اسلوب اور نئی راہیں تلاش کرنی ہوں گی۔ تاکہ ہم اپنی زبان اور ادب کو مکمل کر سکیں۔

میں نے جو یہ سرسری نظر اپنی زبان کے مختلف ارتقائی مدارج پر ڈالی ہے۔ اس سے صرف یہ جتانا مقصود تھا کہ اس نے ہر دور میں زمانے کا ساتھ دیا ہے۔ جب سادگی کی ضرورت تھی تو یہ سادہ تھی۔ جب تکلف و تصنع کی ضرورت پڑی تو اس سے پر تکلف کوئی زبان نہ تھی۔ جب ادبیت اور تنقید کا وقت آیا تو اس نے پورا ساتھ دیا۔ جب اصلاح و ترمیم کا مطالبہ

ہوا تو اس نے منہ نہ موڑا، اب کہ علوم و فنون کا زمانہ ہے تو وہ اس کی خدمت کے لیے بھی حاضر ہے۔ غرض کہ اقتضائے وقت کے لحاظ سے وہ ہر سانچے میں ڈھلنے کے لیے تیار رہی اور اس کی طرف سے کبھی کوتاہی نہیں ہوئی۔ اگر ہم اپنی کوششوں میں کوتاہی نہیں کریں گے تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ سرزمینِ ہند کی مشترکہ اور ادبی علمی زبان یہی ہوگی۔ یہ اس کا حق ہے۔ اور کوئی قوت اسے اس منصب سے نہیں روک سکتی۔

خطبۂ صدارت اُردو کانفرنس لاہور

۸ر دسمبر ۱۹۴۰ء

دوستو اور عزیزو!

آپ نے جب اپنی عنایت سے مجھے اس کانفرنس میں دعوت دی تھی تو میں نے اس کا یہ جواب دیا تھا کہ میں طالب علموں کی دعوت کو جب تک کوئی مجبوری نہ ہو، رد نہیں کرتا۔ اس لیے کہ مجھے طالب علموں سے سابقہ رہا ہے خود عمر بھر میں نے طالب علمی کی ہے اور اب بھی طالب علم ہوں اور آخر دم تک طالب علم رہوں گا۔ اس وجہ سے میں طالب علموں کی جماعت میں اپنے آپ کو کبھی غیر نہیں سمجھتا۔ میں آپ کے پاس ایک پرانے طالب علم کی حیثیت سے آیا ہوں۔ اس لیے بہ نسبت کسی دوسرے شخص کے مجھے آپ سے کہنے سننے کا زیادہ حق حاصل ہے۔

آپ کو معلوم ہے کہ میری زندگی کا ایک ہی مقصد ہے اور وہ اُردو کی خدمت ہے۔ کوئی کچھ کہا کرے میں اس کو ملک کی بہت بڑی خدمت سمجھتا ہوں اور اسے ہر خدمت پر ترجیح دیتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ جس طرح آج میں آپ کا شریک کار ہوں آپ بھی اس کام میں میرے شریک ہوں۔ اور شریکِ غالب ہوں۔

میں جب کبھی طالب علموں کی جماعت میں جاتا ہوں تو مجھے اپنی طالب علمی کا زمانہ یاد آجاتا ہے۔ لیکن آج کل کی اور اس زمانے کی طالب علمی میں بہت بڑا فرق ہے۔ اس زمانے میں طالب علم زیادہ مستعد، زیادہ باہوش اور باخبر ہیں۔ ان کی نظر اپنی کتاب اور اپنے کالج تک محدود نہیں۔ وہ اپنے ملک اور دنیا کے حالات سے بہت زیادہ واقف ہیں اور ان میں حصہ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ سیاسی جماعتوں کے لیڈر آپ کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ جب وہ آپ کی جماعت میں آتے ہیں تو آپ کی تعریفوں کے پُل باندھ دیتے ہیں۔ مثلاً یہ ایک عام فقرہ ہے۔ "قوم کی قسمت آپ کے ہاتھ میں ہے"۔ "آیندہ ملک کے لیڈر آپ ہی ہونے والے ہیں"۔ اس میں کوئی نئی بات نہیں، یہ ہمیشہ ہوتا آیا ہے کہ ایک نسل کی وارث دوسری نسل ہوتی ہے۔ لیکن ہمارا لیڈر کچھ اس انداز سے کہتا ہے کہ آپ خوشی کے مارے پھولے نہیں سماتے۔ دوسرا آتا ہے وہ اس معاملے میں پہلے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتا ہے اور دل کھول کر مبالغہ کرتا ہے مگر اس سلیقے سے کہ مبالغہ معلوم نہیں ہوتا۔ اس خوشی میں کبھی آپ اس کے ساتھ اور کبھی اس کے ساتھ ہو جاتے ہیں۔ اسے بیشک آپ سے ہمدردی ہے لیکن اسی کے ساتھ آپ سے زیادہ اُسے اپنی ذات سے ہمدردی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ آپ اُس کے بڑے بڑے جلوس نکالیں، اس کے حکم پر ہڑتالیں کریں اور اس کے لیے نعرے اور جیکارے اس زور شور سے لگائیں کہ سننے والوں کے کانوں کے پردے پھٹ جائیں۔ اس سے بیشک آپ کی قوت بڑھ گئی ہے اور یہ بڑی خوشی کی بات ہے۔ لیکن جس قدر آپ کی قوت بڑھی ہے اسی نسبت سے آپ کا وقار نہیں بڑھا۔ کیوں کہ

بعض اوقات آپ کے گروہ میں اور عوام کی بھیڑ میں تھوڑا ہی سا فرق رہ جاتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کی قوت کے ساتھ ساتھ آپ کا وقار بھی اُسی نسبت سے بڑھے۔ لیکن باوجود اس کے جو بات سچ ہے وہ کہنی چاہیے اور میں بلا تامل یہ کہنے کے لیے تیار ہوں کہ آج کل کے طالب علم پہلے زمانے کے طالب علموں کے مقابلے میں زیادہ مستعد، زیادہ سرگرم اور پُرجوش اور زیادہ باخبر ہیں۔ اور اس کا ایک ادنا ثبوت خود یہ کانفرنس ہے جو محض آپ کی ذاتی کوشش اور تگ و دو سے منعقد ہوئی ہے۔ آپ نے اس وقت ایک ایسے مسئلے کو لیا ہے جو باوجود ملک کے سیاسی ہیجان کے سب سے زیادہ قابلِ غور مسئلہ ہے اور جس پر قومیت اور ملکی اتحاد کی بنیاد ہے۔ یہ آپ کی موقع شناسی، دُور بینی اور مصلحت اندیشی ہے کہ آپ نے ایسے وقت میں اس کانفرنس کا انعقاد کیا ہے۔ میں آپ کو اس پر مبارک باد دیتا ہوں۔

زبان کا معاملہ اس وقت ہمارے ملک میں بہت نازک اور پیچیدہ ہوتا جاتا ہے اور اُردو بُری طرح لپیٹ میں آگئی ہے۔ حیرت ہے کہ وہ لوگ جو قومیت کے مدعی اور اتحاد کے حامی ہیں وہ کیوں اس زبان سے روگرداں ہیں جس کے خمیر میں اتحاد ہے، جو اتحاد سے بنی۔ اور اگر اہل ملک ذرا غور کریں تو انھیں معلوم ہوگا کہ آیندہ بھی ہمارے بکھرے ہوئے شیرازے کو ایک جا کرنے میں سب سے بڑی مدد اسی سے ملے گی۔

زبان کا زندگی میں بڑا دخل ہے۔ سیاست اور معاشرت اس سے جدا نہیں ہو سکتی۔ تاریخ کے مطالعے سے ظاہر ہے کہ جب کسی قوم نے کسی دوسری قوم کو بزورِ شمشیر مغلوب کیا ہے تو اس کے ساتھ ہی اس قوم کی زبان کو دبایا جاتا ہے۔ کیوں کہ زبان قومی تہذیب اور اتحاد کا بڑا کارگر عنصر ہے۔ اس بات

میں پولستان کی تاریخ سب سے زیادہ عبرت خیز ہو۔

تخمیناً سوا سو سال سے اس بد نصیب ملک کا تکا بوٹی کیا جا رہا ہو۔ تین بار آسٹریا، روس اور پرشیا نے اس کے حصے بخرے کرکے اسے پاش پاش کر دیا اور اب چوتھی بار پھر وہ اسی آفت کا شکار ہو۔ پچھلی صدی میں پرشیا اور روس دونوں نے اسے پامال کرنے اور اس کی قومیت اور تہذیب کے کچلنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ سب سے زیادہ ظلم انھوں نے زبان پر توڑا۔

ابتدائی مدارس میں پولی زبان کی تعلیم کی حکماً ممانعت تھی۔ شروع شروع میں مذہبی تعلیم کی اجازت تھی۔ لیکن بعد میں اس کی بھی ممانعت کر دی گئی اور پولی بچے اس بات پر مجبور تھے کہ اپنی مذہبی تعلیم جرمن زبان کے ذریعہ سیکھیں اور نماز بھی جرمن زبان میں پڑھیں۔ جو بچے اس سے انکار کرتے انھیں تازیانے کی سزا دی جاتی۔ یا بندی خانے میں بھیج دیا جاتا۔ بعض اوقات یہ معصوم بچے اس بیدردی سے پیٹے جاتے تھے کہ پٹتے پٹتے دم توڑ دیتے تھے۔ جن بچوں کو اس وحشیانہ سزا سے بخار چڑھ آتا اور دوسرے روز مدرسے حاضر نہ ہو سکتے تو ان کے والدین کو اس جرم میں جرمانہ کیا جاتا۔

غریب مائیں جن کے دلوں میں حبِّ وطن کی ذرا بھی لگن ہوتی تو وہ اپنے بچوں کو چوری سے خفیہ مقامات میں جمع کرکے انھیں اپنے مذہبی عقائد اپنی زبان میں سکھاتیں تاکہ وہ مذہب سے بالکل بیگانہ نہ رہ جائیں۔ مگر جب کبھی حکّام کو اس کی خبر لگ جاتی تو وہ ان عورتوں کو قید کر دیتے اور ان سے مجرموں کا سلوک کیا جاتا۔

جماعت میں کسی کی مجال نہ تھی کہ پولی زبان کا ایک لفظ بھی کوئی اپنی زبان سے نکال سکے۔ ابتدائی مدرسوں میں بھی بچے اپنی زبان میں بات چیت نہیں

کر سکتے تھے۔ ان مدرسوں کے استاد جرمن ہوتے تھے اور جرمن زبان پڑھاتے تھے۔ لفظوں کے معنی کبھی پولی زبان میں نہیں بتاتے تھے۔ بلکہ تصویروں، اشاروں اور طرح طرح کی ترکیبوں سے سمجھاتے تھے۔ مگر پولی زبان کی آواز ان بچّوں کے کانوں تک نہیں پہنچنے دیتے تھے۔ ثانوی مدارس میں بھی تقریباً یہی حال تھا۔ وہاں جرمن استاد پولی تاریخ اور تمدن اور ہر پولی شے کا ذکر نہایت حقارت سے کرتے اور پولی زبان کی ہنسی اڑاتے۔ لڑکے یہ سب کچھ سنتے اور زہر کا سا گھونٹ پی کر خاموش رہ جاتے۔ ان باتوں سے لڑکوں کی زندگی تلخ ہو جاتی۔ اگر کسی لڑکے کے پاس پولستان کی تاریخ کی یا ادب کی کتاب پائی جاتی تو اُسے اسکول سے خارج کر دیا جاتا اور پھر وہ کسی مدرسے داخل نہ ہونے پاتا اور اس کی ساری زندگی خراب ہو جاتی۔

زبان پر یہ ظلم وستم صرف مدارس کے احاطوں تک محدود نہ تھا۔ والدین اپنے بچوں کے لیے پولی استاد یا استانی نہیں رکھ سکتے تھے۔ جرمن افسروں کو اختیار تھا کہ جس وقت چاہیں وہ کسی پولی کے گھر میں گھُس کر یہ دیکھ سکتے تھے کہ کوئی بچّہ پولی زبان تو نہیں پڑھ رہا ہے۔ وہ مدرسے کے باہر گلی کوچوں اور بازار میں بھی اپنی زبان میں بات چیت نہیں کر سکتے تھے۔

اسی پر بس نہیں کیا گیا۔ پولوں کو اپنے پبلک جلسوں میں بھی پولی بولنے کی ممانعت تھی۔ ریلوے اسٹیشن کے ٹکٹ گھر پر پول کو ٹکٹ جرمن زبان میں مانگنا پڑتا تھا۔ اگر وہ جرمن زبان نہیں جانتا تو اُسے اپنے ساتھ ترجمان لے جانا لازم تھا۔ اگر کسی ریستوران میں کوئی پولی ملازم اپنی زبان بولتا ہوا سنائی دیتا تو فوراً نوکری سے موقوف کر دیا جاتا۔ اگر کسی کسان کو دوا کی ضرورت ہوتی اور عطار کی دکان پر جاتا تو اسے اپنی زبان میں دوا مانگنے کی اجازت نہ تھی۔ عدالت

میں پولی کی شہادت جرمن مترجم کے ذریعے سے سُنی جاتی۔ جو غریب پول (مرد ہو یا عورت) اپنی زبان کے سوا کسی دوسری زبان میں حلف نہ اٹھا سکتا تو وہ قید خانے بھیج دیا جاتا۔ شہروں، قصبوں اور گلیوں کے پولی نام بدل کر جرمن کر دیے گئے۔ اصطباغ کے بعد والدین اپنے شیر خوار بچے کا نام اپنی مرضی سے تجویز کرتے لیکن سرکاری رجسٹر میں اس کا جرمن نام لکھا جاتا۔ جن خطوں پر پتا پولی زبان میں ہوتا وہ ڈاک خانے میں روک لیے جاتے۔ تار ہر زبان میں بھیجے جا سکتے تھے مگر نہیں بھیجے جا سکتے تھے تو پولی زبان میں۔

روسی مقبوضہ علاقے میں بھی یہی حال تھا۔ گرجاؤں میں پولی زبان کے استعمال کی ممانعت تھی۔ جو پادری اس کی خلاف ورزی کرتے وہ جلا وطن کر دیے جاتے یا قید خانوں میں ڈال دیے جاتے۔ وارسا کی یونی ورسٹی اور مدارس میں سب اُستاد روسی تھے۔ دیہاتی مکتبوں میں بھی بچوں کو روسی پڑھنی پڑتی تھی۔ نجی بات چیت میں بھی پولی زبان استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ ہسپتالوں میں بیمار اپنی زبان سننے اور بولنے سے محروم تھے۔ یہاں تک کہ مریض بچوں کو بھی اپنی زبان میں کچھ کہنے کی اجازت نہ تھی۔

کیا ان حالات میں کوئی گمان کر سکتا تھا کہ اس زبان کا وجود دنیا میں باقی رہے گا؟ لیکن باوجود غیر معمولی سختیوں اور جبر و استبداد کے وہ اب تک باقی ہے اور تین کروڑ مخلوق کو اس کے بولنے کا فخر حاصل ہے اور اس کا ادب یورپ کی زبانوں میں اب بھی باوقعت خیال کیا جاتا ہے یہ کیوں؟ یہ اس لیے کہ پولوں کو اپنی زبان جان سے زیادہ عزیز تھی۔ وہ خوب سمجھتے تھے کہ اگر زبان ہم سے چھین لی گئی تو ہماری ہستی بے معنی ہو جائے گی۔ اس لیے وہ اس کی خاطر جان و مال اور ہر چیز کو قربان کرنے کے لیے تیار رہتے۔ ان کے شاعروں کی

دل گداز نظموں نے اس آگ کو بھڑکایا اور باوجودے کہ ان کے کلام کے پڑھنے رکھنے اور چھپنے کی اجازت نہ تھی اور اس کی سختی سے نگرانی کی جاتی تھی، تاہم اس ملک کے مظلوم نوجوان تہ خانوں میں چھپ چھپ کر رات کی تاریکی میں مقفل کمروں کے اندر دھیمی روشنی میں ان دستی لکھی ہوئی نظموں کو مل کر پڑھتے تھے اور چوں کہ پولیس کا کھٹکا ہر وقت لگا رہتا تھا۔ اس لیے ان میں سے ایک گلی کے نکڑ پر چھپا ہوا پہرا دیتا رہتا تھا اور جب دیکھتا تھا کہ پولیس آرہی ہے تو اپنے ساتھیوں کو فوراً خبردار کر دیتا اور وہ جلدی جلدی پڑھ کر ان نظموں کو دہکتی ہوئی آگ میں جھونک دیتے۔

اس سرسری بیان سے جو دراصل مظلوموں کی زبان کا بیّن ثبوت ہے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ زبان ایک بڑی قوت ہے اور قومیت اور تہذیب کی جان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مخالف سب سے پہلے اس پر ہاتھ ڈالتا ہے اور اسے مٹانے یا کم زور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ زبان والے اگر اس راز سے واقف ہیں تو انھیں اس کے بچانے کے لیے ہر قسم کی قربانی کرنی پڑتی ہے۔

ہم پر ابھی ایسا وقت نہیں آیا ہے اور خدا نہ کرے کبھی ایسا وقت آئے۔ لیکن مخالفت کی ہوا چلنی شروع ہو گئی ہے۔ یہ آندھی اوّل اوّل الہ آباد سے اٹھی اور وردھا میں اس نے زور پکڑا اور اب رفتہ رفتہ سارے ملک پر چھایا چاہتی ہے۔ میں پچھلے ہفتے الہ آباد میں ایک روز ٹھیرا تھا۔ سر تیج بہادر سپرو نے اس مخالفت کی جو درد بھری کہانی سنائی اس کا اثر اب تک میرے دل و دماغ پر ہے اور خود انھیں اس کا بڑا صدمہ ہے۔ میں ان ناگوار واقعات کو یہاں دہرانا نہیں چاہتا لیکن جنھیں اس کی تفصیل سننی منظور ہو وہ الہ آباد جانے کی تکلیف کریں اور خود اس بزرگ کی زبانی سُن لیں جو حق بات کہنے میں

کبھی نہیں چوکتے، جو کسی کے جانب دار نہیں اور ملک کے بے ریا دوست اور سچے بہی خواہ ہیں۔

ہم سے کہا جاتا ہے کہ اردو غلامانہ ذہنیت کی یادگار ہے۔ یہ زبان مسلمان بادشاہوں کی پھیلائی ہوئی ہے۔ ان باتوں کو کہنے والے صرف ناواقف اور معمولی لوگ نہیں۔ ان میں تعلیم یافتہ اور روشن خیال لوگ بھی ہیں اور ایسے لوگ بھی ہیں جو نیک دل اور صلح جو ہیں اور ایسے بھی ہیں جو اردو کے مسلّم ادیب اور زباں داں ہیں۔ سچ ہے تعصب آدمی کو اندھا کر دیتا ہے۔ کبھی تو وہ یہ سوچتے کہ وہ یہ کیا کر رہے ہیں۔ اگر غلامانہ ذہنیت کا اشارہ دورِ محکومی کی طرف ہے تو یہ لعنت اس ملک پر آج سے نہیں ہزارہا سال سے ہے اور اب بھی اگر محکومی کا زمانہ صرف اسلامی اور انگریزی عہد تک محدود رکھا جائے تو اس طویل مدت میں ہمارے اہلِ وطن نے زندگی کے مختلف شعبوں میں جو کچھ کیا، بنایا، سنوارا سب قابلِ ترک اور اس سے ہزار دو ہزار برس پہلے جو کچھ تھا بُرا بھلا، سب قابلِ اختیار۔ یہ ہے غلامانہ ذہنیت۔

اب رہی یہ بات کہ "یہ زبان مسلمان بادشاہوں نے پھیلائی اور ہمیں بہ تقاضائے وقت، ضروریاتِ زمانہ سے مجبور ہو کر اپنے اغراض کے لیے سیکھنی پڑی جیسے آج کل انگریزی سیکھنی پڑتی ہے"، سراسر بہتان اور خلافِ واقعہ ہے۔ اگر یہ بات وہ فارسی کے متعلق کہتے تو ایک حد تک بجا ہو سکتی تھی۔ لیکن اردو کے متعلق یہ کہنا اپنے نفس کو اور دوسروں کو دھوکا دینا ہے۔ اردو خالص ملکی زبان ہے اور انگریزی عہد میں دفتری، عدالتی اور تعلیمی زبان ہوئی۔ مسلمان بادشاہوں کے زمانے میں یہ نہ دفتر و عدالت کی زبان تھی، نہ تعلیم کی۔ انھوں نے کبھی اسے منہ نہ لگایا اور نہ قابلِ توجہ سمجھا۔ آخر تاریخ بھی کوئی چیز ہے؟ واقعات کو بھی ہمارے

معاملات اور بحث میں کچھ دخل ہی یا نہیں ؟ یہ تو صریحاً تاریخ کا گلا گھونٹنا اور واقعات کا خون کرنا ہی۔ اس قسم کے خیالات سے لوگوں کے دلوں میں بدگمانی پیدا کی جاتی اور تعصب کا بیج بویا جاتا ہی۔ نتیجہ یہ ہی کہ اب ہر چیز میں اختلاف اور تفریق پیدا ہوتی جاتی ہی۔ خوراک میں، پوشاک میں، بول چال میں، وضع قطع میں، آداب و اطوار میں دونوں قومیں رفتہ رفتہ الگ ہوتی جاتی ہیں آخر یہ اختلاف بڑھتے بڑھتے کہاں تک پہنچے گا اور اس ملک کا کیا انجام ہوگا ! سی۔ پی کی کانگرس گورنمنٹ تو اس معاملے میں سب سے سبقت لے گئی، اس نے ایسے شہروں اور مقاموں کے نام بھی بدل دیے جو ایک زمانے سے زبان زد خلائق چلے آرہے تھے۔ مثلاً ہندستانی علاقے کو مہاکوشل، برار کو ودھرو، ناگ پور کو ناگیشور، سے بدل دیا۔ گاندھی جی سیگاؤں میں مقیم ہیں یہ سیگاؤں ہی لکھا اور بولا جاتا تھا مگر اب کچھ دنوں سے یہ شِو گرام ہوگیا ہی۔ یہ ہی غلامانہ ذہنیت یا بہ اصطلاح نفسیات، جنونِ کمتری۔

ہماری انجمن اور اس کے اخبار کو طرح طرح مطعون اور بدنام کیا جاتا ہی کوئی اسے فرقہ پرست کہتا ہی۔ کوئی اسے مسلم لیگ کی شاخ بتاتا ہی۔ کوئی ہندی کا مخالف، اُدھر سے حملے پر حملے ہوں تو کچھ بھی نہیں۔ ہم اگر اپنے بچاؤ میں کچھ کہیں تو قابلِ الزام۔

بات پر واں زبان کٹتی ہی
وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

ہم کسی زبان کے مخالف نہیں۔ ہر زبان کو ترقی کرنے کا حق حاصل ہی۔ ہمارا کہنا صرف یہ ہی کہ اُردو ہماری اور آپ کی زبان ہی۔ یہ ہماری اور آپ کی تہذیب اور تمدّن، ہماری آپ کی زبانوں اور ہمارے آپ کے اتحاد کی یادگار ہی۔ ہمارے آپ کے اسلاف نے بڑی محنت اور جانکاہی سے

اسے بنایا، پالا پوسا اور بڑھایا۔ آپ کیوں نہیں اُسے ویسے ہی اپنی زبان سمجھتے جیسے اب تک سمجھتے آئے تھے۔ کیوں نہیں اسے ملکی زبان مانتے جیسے اب تک مانتے آئے تھے۔ اگر یہ نہیں تو کم سے کم اس کی مخالفت نہ کیجیے اور جس طرح اور جہاں جہاں وہ کچھ دنوں پہلے تھی اُسے ویسے ہی رہنے دیجیے اور نکالنے کی کوشش نہ کیجیے۔ یہی ایک صورت مصالحت کی ہے۔ اور اگر یہ بھی منظور نہیں تو پھر معاملہ صاف ہے۔ آپ کی راہ اور ہماری راہ اور۔ جو ہونا ہے ہو رہے گا۔ اپنی اپنی کوشش اور اپنی اپنی قسمت۔ لیکن یہ یاد رہے کہ اس کے بعد اتحاد کے تمام دعوے اور منصوبے باطل ہوں گے۔

حضرات! آپ کا صوبہ بہت قابلِ مبارک باد ہے کہ یہاں کم سے کم لسانی اتّحاد ہے۔ آگے چل کر یہ اتحاد آپ کے بہت کام آئے گا اور دوسرے چھوٹے موٹے اختلافوں پر غالب آجائے گا۔ اور کچھ تعجب نہیں کہ اگر صورت حال یہی رہی تو آپ کا صوبہ ایک دن ہندستان کے دوسرے صوبوں کے لیے قابلِ تقلید مثال ثابت ہو۔ آپ کے صوبے نے اُردو کی بڑی خدمت کی ہے۔ اس کا اعتراف نہ کرنا صریح حق ناشناسی ہوگی۔ لیکن یہ معاملہ کسی ایک صوبے کا نہیں رہا۔ یہ مسئلہ سارے ہندستان کا ہوگیا۔ اور اس جد و جہد میں آپ کی شرکت ضروری ہے۔

البتہ آپ کی یونی ورسٹی سے ایک بڑی شکایت ہے کہ اس نے اُردو زبان کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ جو صوبہ اُردو کے رواج میں سب سے سبقت لے گیا ہے وہاں کی یونی ورسٹی اُردو کی طرف سے ایسی بے التفاتی کرتی ہے تو سخت افسوس ہوتا ہے۔ مجھے یہ معلوم کرکے حیرت ہوئی کہ آپ کی یونیورسٹی کے امتحانات الف۔ اے اور بی۔ اے میں اُردو کا

صرف ایک زائد پرچہ پچاس نمبر کا ہے۔ یہ طالب علم کی مرضی پر ہے کہ اس میں امتحان دے یا نہ دے۔ اس پر طرّہ یہ ہے کہ اس پرچے کے نمبر طالب علم کی کامیابی یا ناکامیابی پر کچھ اثر نہیں رکھتے اور سائنس کی جماعت میں داخلے کے وقت اس پرچے کے نمبر ہی خارج کر دیے جاتے ہیں۔ یہ عجیب و غریب پرچہ ہے اس کی نظیر مشکل سے کسی یونی ورسٹی میں ملے گی۔ البتہ لڑکیوں کو کسی قدیم زبان کی بجائے اُردو لینے کا اختیار ہے۔ لیکن سوالات کے جواب انھیں انگریزی میں دینے پڑتے ہیں۔ خیال فرمایئے کہ غالب و مومن کے اشعار کی تشریح یہ بچاری لڑکیاں انگریزی میں کیا بیان کریں گی۔ یہ اُردو کے رستے میں ایک اور رُکاوٹ ہے۔

یونی ورسٹی کے قواعد و ضوابط میں دل لگی اور ظرافت کا کوی موقع نہیں ہوتا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب یونی ورسٹی کے نصاب بناتے وقت کسی ستم ظریف کو دل لگی سوجھی اور اس نے چپکے سے یہ مضحکہ خیز پرچہ نصاب کے لیے پیش کر دیا اور دوسرے ممبر یا تو سمجھے نہیں یا کاہلی کی وجہ سے انھوں نے غور نہیں کیا اور منظور ہو گیا۔ اب جو منظور ہو گیا تو پتھر کی لکیر ہو گیا۔ الہ آباد، لکھنؤ، علی گڑھ کی یونی ورسٹیوں میں اُردو زبان و ادب کے الگ شعبے ہیں۔ ان کے لیے پروفیسر، ریڈر، لکچرار مقرر ہیں۔ ان کو جانے دیجیے کہ یہ یونی ورسٹیاں اُردو کے صوبوں میں ہیں۔ مدراس کو لیجیے وہاں تقریباً ساٹھ سال سے اُردو یونی ورسٹی کے امتحانات میں مستقل مضمون ہے۔ ایم۔ اے تک کا امتحان اُردو میں دے سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ مدراس یونی ورسٹی نے اردو کے لیے ایک ری سرچ کا شعبہ بھی قائم کر رکھا ہے۔ اور اس کے سوا افضل العلما، ادیب فاضل، ادیب عالم، ادیب اور طب کے امتحانات

میں اُردو کا پرچہ لازمی طور پر شریک ہے۔ ہماری یونی ورسٹیوں کو کچھ تو شرمانا چاہیے۔
آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ آج سے سو برس پہلے اس علاقے میں جو اقلیم اردو کا خطہ ہے اُردو اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ تھی۔ میری مراد دہلی کالج سے ہے۔ جہاں تمام علوم جدیدہ یعنی کیمیا (کیمسٹری)، طبیعیات، معاشیات، ریاضیات، قانون، تاریخ، اور دوسرے تمام علوم اُردو کے ذریعے سے پڑھائے جاتے تھے۔ اُس زمانے کے جن افسرانِ تعلیم اور اہل علم نے اس کالج کا معائنہ کیا۔ انھوں نے تصدیق کی ہے کہ دہلی کالج کے طالب علم سائنس میں ایسے ہی مستعد اور قابل ہیں جیسے ان کالجوں کے جہاں تعلیم انگریزی زبان کے ذریعے سے ہوتی ہے۔ اس کالج کی مجلس ترجمہ نے علوم جدیدہ میں تقریباً دو سو کتابیں تالیف یا ترجمہ کیں۔ اور اصطلاحاتِ سائنس کے لیے قواعد وضع کیے جو اب بھی کارآمد ہیں۔
ہم شمالی ہند کی اور خاص کر پنجاب اور دلّی کی یونی ورسٹیوں سے یہ التجا کرتے ہیں کہ اگر انھیں آگے بڑھنے سے چڑ ہے تو نہ بڑھیں۔ کم سے کم سو سال پیچھے ہی ہٹ جائیں۔ یہ آپ کا حق ہے اور اس مطالبے میں آپ بالکل حق بجانب ہیں کہ یہ ناکارہ، فرسودہ، اور ناشایستہ طریقہ یک لخت موقوف کر دیا جائے اور اُردو کا مستقل شعبہ قائم کیا جائے اور تمام علوم کی تعلیم اُردو زبان کے ذریعے سے دی جائے۔ جب سو سال قبل اس میں کام یابی ہو سکتی تھی اور آج جامعہ عثمانیہ میں بلا دقت کام یابی سے یہ کام ہو رہا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ پنجاب اور دلّی کی یونیورسٹیاں اس میں کام یاب نہ ہوں۔ آپ ضرور یہ مطالبہ کیجیے اور جب تک آپ کا مطالبہ پورا نہ ہو آپ اس تحریک کو شد و مد کے ساتھ جاری رکھیے۔ جن یونی ورسٹیوں میں ہماری زبان و تہذیب کو بار یابی کی اجازت نہیں وہ ہماری یونی ورسٹیاں نہیں ہو سکتیں۔ ہم ایسی

یونی ورسٹیوں کی ضرورت ہی جن کے دروازوں پر ہماری زبان کے لیے No admission کی تختی لگی ہوئی ہی۔

پنجاب کے طالب علمو! تھیں یاد ہو کہ نہ ہو کہ سیّد مرحوم نے اہلِ پنجاب کو "زندہ دلانِ پنجاب" کا خطاب دیا تھا۔ اسے معمولی خطاب نہ سمجھنا۔ دنیا کا سب سے بڑا اور سب سے قابلِ قدر خطاب ہی۔ آپ اس پر جس قدر خوش ہوں اور جس قدر ناز کریں بجا ہی۔ اس مصلحِ اعظم نے سارے ہندستان میں صرف اہلِ پنجاب کو اس پُرعظمت خطاب کا سزاوار سمجھا۔

عزیزو! اگر آپ کے دل میں اس خطاب کی عزّت ہی اور آپ کو اس کی اہمیت کا کافی احساس ہی تو اس کی لاج رکھنا آپ کے ہاتھ ہی۔ اگر فی الحقیقت آپ میں اب بھی زندہ دلی باقی ہی اور آپ نے یہ کانفرنس محض نمائش اور تماشے کے لیے نہیں کی تو آج آپ سچّے دل سے عہد کیجیے کہ آپ کہیں بھی ہوں اور کسی حال میں ہوں ہمیشہ اُردو کی ترقّی کے خواہاں اور اس کی اشاعت میں کوشاں رہیں گے کیا آپ ایسا عہد کرنے کے لیے تیار ہیں؟ میں خوش ہوں کہ آپ اس کا عہد کرتے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ نے سوچ سمجھ کر اور خلوصِ دل سے یہ عہد کیا ہی لیکن آج کل زبانی وعدے زیادہ قابلِ اعتماد نہیں ہوتے۔ ایفائے وعدہ عمل سے دیکھا جاتا ہی۔ مجھے یقین ہی کہ آپ اس کی پابندی کریں گے اور اپنے عمل سے ثابت کر دیں گے کہ کام کرنے والے یوں کام کیا کرتے ہیں۔
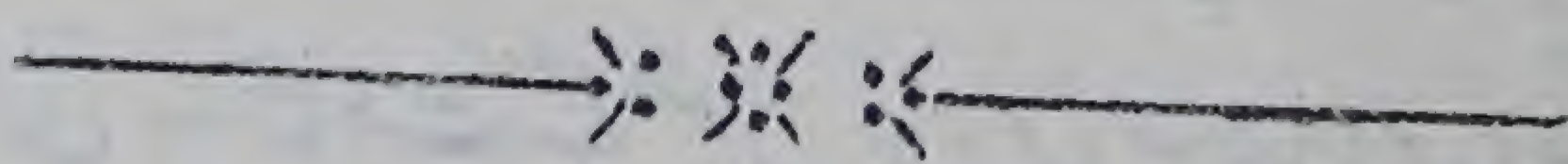
خطبۂ صدارت اُردو کانفرنس۔ گوالیار

۲۷ر جنوری ۱۹۴۱ء

ای صاحبو!

آپ نے جس شوق اور جوش سے اُردو کانفرنس کے انعقاد کا اہتمام کیا ہی اس کی داد نہ دینا ناانصافی ہوگی۔ میں آپ کی انجمن کی سرگرمیوں کا حال سن چکا تھا۔ لیکن آج میں نے اپنی آنکھوں دیکھ لیا۔ شکر ہی کہ جیسا سنا تھا ویسا ہی پایا۔ آپ کی کانفرنس ہمارے دوسرے جلسوں کی طرح نمایشی نہیں ہی اس کا مقصد تھوڑی دیر کی تفریح یا تفنن نہیں بلکہ جیسا کہ مجھے معلوم ہوا ہی۔ آپ حقیقی طور پر کچھ کام کرنا چاہتے ہیں یعنی جو کچھ آپ کر رہے ہیں اسے اور ترقی دینا اور بڑھانا چاہتے ہیں۔

زبان کا مسئلہ جس کے لیے آپ نے یہ اہتمام کیا ہی بدقسمتی سے روز بہ روز پیچیدہ اور نازک ہوتا جاتا ہی۔ ایسے زمانے میں آپ کا اس طرف توجہ کرنا اور اپنی زبان کی ترقی و اشاعت کے متعلق تجویزیں سوچنا اس امر کی دلیل ہی کہ آپ وقت کو پہچانتے ہیں اور سوچ سمجھ کر موجودہ ضروریات کو پورا کرنے اور آنے والے واقعات کے مقابلے کے لیے تیار ہیں۔

آپ کی ریاست کو جو تاریخی حیثیت حاصل ہے اس سے آپ بہ خوبی واقف ہیں۔ تفصیل کی حاجت نہیں۔ یہاں کے فرماں روا خاندان کے مورثِ اعلا کو سب سے پہلے شہنشاہ اورنگ زیب نے عہدہ اور خطاب عطا کیا تھا۔ شاہ عالم بادشاہ پر جب مصیبت نازل ہوئی اور بیدرد غلام قادر روہیلہ نے بادشاہ کی آنکھیں نکال لیں اور تخت سے اتار دیا اور شاہی خاندان کو پامال کر دیا تو اس وقت بادشاہ کو مادھوجی سندھیا کے سوا کوئی ہمدرد اور دوست نظر نہ آیا۔ چناں چہ وہ اپنی فارسی غزل میں جو اس حادثے کے متعلق لکھی تھی مادھوجی سندھیا کو کس محبّت سے یاد کرتے ہیں۔

مادھوجی سندھیا فرزند جگر بند من است
ہست مصروف تلافی ستمگاری ما

یہ مخلصانہ تعلقات تھے جنھوں نے باہمی اتحاد پیدا کر دیا تھا اور جو کئی صدی سے چلا آ رہا تھا اور اسی نے تہذیب اور زبان کی بنیاد ڈالی جو ہندو مسلم دونوں میں مشترک اور دونوں کی وراثت ہے۔ چناں چہ وسط ہند اور راجپوتانہ کی ریاستوں میں درباری قاعدے، معاشرتی آداب و رسوم وہی رائج ہو گئے جو مغلیہ حکومت میں تھے۔ عدالتوں اور دفتروں کی زبان فارسی ہو گئی۔ جب فارسی کی جگہ اُردو نے لے لی تو ان ریاستوں میں بھی اُردو کا دور دورہ ہو گیا۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اتحاد کا سب سے بڑا ذریعہ اُردو ہوئی۔ چوں کہ یہ ہندو مسلم دونوں کی زبانوں اور تہذیبوں سے مل کر بنی تھی اس لیے اس نے ہر جگہ گھر کر لیا اور سارے ہندستان پر چھا گئی۔ اب اگر اس بنا پر ملکی زبان ہونے کا دعویٰ کرے تو وہ بالکل حق بجانب ہے۔
عجیب بات ہے کہ اس زبان کی جو اصل خوبی ہے وہی نکتہ چینوں کی

نظروں میں عیب بن گئی ہے اور ہمارے بعض مہربانوں نے اِسے نشانۂ ملامت بنا رکھا ہے۔ کہتے ہیں یہ خالص زبان نہیں مخلوط ہے۔ اس لیے ملکی زبان نہیں ہوسکتی۔ بے شک یہ مخلوط ہے اور مخلوط ہونا ہی اس کے حق میں سب سے بڑی دلیل ہے کہ یہی زبان قومی زبان ہونی چاہیے۔ یہ سب کی بولی ہے۔ ملک کے اکثر علاقے اور قومیں اس کے بنانے میں شریک رہی ہیں۔ یہ کچھ ہندستان ہی کی قوموں پر موقوف نہیں بلکہ غیر قوموں نے بھی اس کی تعمیر میں حصّہ لیا ہے۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ تقریباً ایک سو اینگلو انڈین اور یورپین ایسے ہیں جنھوں نے شعر کہے ہیں اور بعض ان میں سے صاحب دیوان ہیں۔

علاوہ اس کے یہ کہ اس نے یک جہتی اور اتحاد پیدا کیا۔ مخلوط ہونے سے خود زبان کو بڑا فائدہ پہنچا۔ اس کے لغات کا ذخیرہ بڑھ گیا جس سے مختلف قسم کے خیالات اور جذبات کے ادا کرنے میں آسانی ہوگئی اور ایک خیال اور واقعے کو صحت وحسن کے ساتھ بیان کرنے کے لیے الفاظ کے انتخاب کا ایک وسیع میدان ہاتھ آگیا جو ادیب اور شاعر کے لیے بڑی نعمت ہے۔

لیکن سب سے تازہ اعتراض وہ ہے جو سمپورنا نندجی نے اپنے صدارتی خطبے میں کیا ہے جو آل انڈیا ہندی ساہتیہ سمیلن کے گزشتہ سالانہ جلسے میں پونا میں پڑھا گیا تھا۔ اس میں وہ اُردو کو مصنوعی زبان بتاتے ہیں۔ زبان انسانی زندگی، ضرورت اور خواہشات سے پیدا ہوتی ہے۔ وہ کسی سازش یا چند لوگوں کی کوشش کا نتیجہ نہیں ہوتی۔ ایک ایسی زبان کو جس کے بولنے والے کروڑوں انسان ہیں مصنوعی کہنا دن کو رات یا رات کو دن کہنا ہے۔ البتہ بعض نیک دل انسانوں نے دنیا میں زبانوں کی کثرت اور خلفشار کو دیکھ کر ازراہِ ہمدردی اپنے اپنے زمانے میں ایک عالم گیر زبان یعنی جگت بھاشا

بنانے کی کوشش کی - اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ زبانوں کے اس ہجوم میں
ایک زبان ایسی ہو جو ان بے ضابطگیوں سے پاک ہو جو مروجہ زبانوں میں
پائی جاتی ہیں تاکہ لوگ اُسے آسانی سے سیکھ لیں اور وہ دنیا بھر میں رائج
ہو سکے - لیکن اس قسم کی زبانیں جو منطقی اصولوں اور خاص منصوبوں کے
تحت بنائی جاتی ہیں رواج نہیں پا سکتیں اور آخر ان نیک نفس لوگوں کی
کوششوں کا بھی یہی حشر ہوا - اس قسم کی زبانوں کو ہم بلا شبہہ مصنوعی کہہ
سکتے ہیں لیکن کسی ایسی زبان کو مصنوعی کہنا جس کے بولنے والے کروڑوں
کی تعداد میں ہوں اور جو ادبی خوبیوں سے مالا مال ہو - کسی حال میں جائز
نہیں - ایسا کہنا بڑی دھاندلی ہے یا کم علمی کی دلیل ہے - اس میں شک نہیں
کہ زبانوں کے بننے اور ترقی پانے میں انسان کے ارادے اور خواہش کا بھی
دخل ہے لیکن اس سے زیادہ اس کی ساخت میں قدرت کا ہاتھ ہے اور
قدرت کے قاعدے عجیب و غریب ہیں جن پر انسان کو پوری دسترس حاصل نہیں
اس لیے اس زمانے میں بھی جو لوگ مصنوعی زبان بنا کر ملک میں رائج کرنا چاہتے
ہیں خواہ وہ کسی ارادے سے ہو - ان کی قسمت میں بھی ناکامی لکھی ہے - سمپورنانند جی
اور ان کے ہم خیال اصحاب کو جو اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں - پچھلے تجربوں
سے سبق حاصل کرنا چاہیے -

ہم جو اُردو کو ملکی زبان کی حیثیت سے پیش کر رہے ہیں اس کی ایک
وجہ تو ظاہر ہے کہ اسے اب تک یہ حیثیت حاصل ہے مگر سب سے بڑی وجہ
یہ ہے کہ اس زمانے میں جب کہ اختلافات کی رَو روز بہ روز قوت پکڑ رہی ہے
جذبات عقل و شعور پر غالب آ گئے ہیں اور نفاق نے دلوں میں گھر کر لیا ہے ،
ہم ان جذبات کو دھیما کرنے اور اختلافات کے فصل کو کم کرنے کے لیے اسے پیش

کرتے ہیں کہ یہ اتفاق و اتحاد کی گود میں پلی ہے۔ اس نے خیالات و معاشرت اور تہذیب میں یک جہتی پیدا کی ہے اور اب بھی اس مہم کے انجام دینے کے لیے آمادہ ہے۔ یہ خوب سمجھ لینا چاہیے کہ جب تک زبان کا مسئلہ طے نہ ہوگا سب منصوبے، خواہ وہ کیسے ہی برتر اور اعلا ہوں ناکام رہیں گے اور ہم نہیں چاہتے کہ وہ دن آئے کہ اہلِ ملک کی کوششیں رائگاں جائیں۔ کامیابی کے لیے پہلی شرط اتحاد ہے۔ اتحاد کا پہلا قدم زبان کا اتحاد ہے اور انسانی اتحاد کے لیے اس زبان کا ہونا لازم ہے جس میں سب کا حصہ ہے اور وہ زبان اس ملک کے لیے سوائے اُردو کے کوئی اور نہیں ہو سکتی کیوں کہ یہ اتحاد سے بنی اور اتحاد ہی کے لیے بنائی گئی اور اب بھی اس اہم فرض کو ادا کر سکتی ہے کیوں کہ یہ اس کے خمیر میں ہے۔

ہم کسی زبان کے مخالف نہیں۔ ہر زبان کو بڑھنے اور ترقی کرنے کا حق ہے اور ہندی کی مخالفت تو ہم کر ہی نہیں سکتے کیوں کہ ہندی نہ صرف ہماری زبان کی زیب و زینت ہے بلکہ اس کی جان ہے۔ اس پر بنی اور اسی پر اس کی قوت ہے اور ہم نے اُسے اس رُتبے تک پہنچایا کہ وہ علمی اور ادبی زبان ہو گئی اور اب اُردو کے نام سے موسوم اور مشہور ہے لیکن سمپورنا نندجی تو ایک ایسی زبان رائج کرنا چاہتے ہیں کہ جو نہ ہندی ہے نہ اُردو اور نہ ہندستانی اور نہ شہری اور نہ دیہاتی اور اسی مبارک زبان میں انھوں نے اپنا ایڈریس لکھا ہے اسے ہم مصنوعی کہیں تو بے جا نہ ہوگا اور لطف یہ ہے کہ اس ہندی کو وہ صوبہ سرحد، ملا بار وغیرہ میں رائج کرنا چاہتے ہیں۔ جہاں ہندی کے نام سے بھی کوئی واقف نہیں اور ایک غضب انھوں نے یہ کیا ہے کہ برج بھاشا، اودھی، بندیل کھنڈی، پوربی، میتھلی وغیرہ بولیوں کو بھی اپنی ہندی سے

خارج کر دیا حالاں کہ اصلی ہندی یہی ہے۔ اس بارے میں ہم اپنے ایک محقق دوست کا قول نقل کرتے ہیں :۔

"اُردو ہندی کا جھگڑا بعض چند تنگ نظر اور رجعت پسند لوگوں تک محدود ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ہندستانی اس زبان کو کہتے ہیں جو شمالی ہندستان کے شہروں اور قصبوں کی عام زبان ہے اور ہزار سال سے بنتے سنورتے اس درجے تک پہنچی ہے کہ گھر گھر بولی جاتی ہے اور جنوبی ہندستان میں بھی سمجھی جاتی ہے۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ پھر ہندی کسے کہتے ہیں تو اس کا جواب بہت آسان ہے یعنی اگرچہ ہندستان کی ہر بولی ہندی ہے، کوئی مشرقی (بنگالی، اڑیہ، اسامی) کوئی مغربی (برج، پنجابی، پشتو، سندھی) اور کوئی جنوبی (تامل، تلنگی، کنڑی، ملیالم) لیکن عرفِ عام میں اب ہندی بولیاں دو ہی تسلیم کی جاتی ہیں۔ ایک برج بھاکا جو سری کرشن جی کی سرزمین اور مہابھارت کی یاد دلاتی ہیں اور دوسری اودھی جو رام چندر جی کی راج دہانی اجودھیا اور رامائن کی یادگار ہے ان دونوں سرزمینوں میں جو بولیاں رائج ہیں وہ واقعتہً ہندو مذہب کے نقطۂ نظر سے بہت مقدس ہیں لیکن ان میں کوئی لٹریچر نہیں اور دیہات کی ابتدائی اور معمولی ضرورت کے علاوہ کوئی ادبی یا تجارتی کام ان سے نہیں لیا جا سکتا۔ اس بولی کو جہاں بھی تمدنی ضروریات سے واسطہ پڑتا ہے یہ اردو ہو جاتی ہے۔

اس کے علاوہ جس طرح دوسری ہندیوں کا لٹریچر اور

شاعری صرف سنسکرت کے طرز بیان اور عروض تک محدود ہے
اسی طرح برج اور اودھی بھی ایک تنگ اور مختصر دائرے میں
رہنے کے بعد مردہ ہو رہی ہیں اس پر ستم یہ ہو رہا ہے کہ بجائے
اس کے ان کو فطری طریقے پر ترقی کرنے کا موقع دیا جائے ان ہندی
بولیوں کے دوست نما دشمن پھر اس کی گریمر کو پانی نی کی ویاکرن
میں جکڑنا چاہتے ہیں اور فارسی کی پر کیف اور روح پرور نغمہ سنجیوں تک
پہنچنے کا راستہ روکے کھڑے ہیں ۔"

اگر ہم ان خیالات پر نظر رکھیں اور دلوں سے بیجا تعصبات اور جذبات کو نکال کر زبان کے ارتقا اور نشو و نما کے اصولوں پر غور کریں اور ملک کی بہبودی کو مقدم سمجھیں تو زبان کے مسئلے کا حل ہونا دشوار نہیں۔ لیکن بہ ظاہر موجودہ حالات اس کے سازگار نہیں معلوم ہوتے۔

ان بحثوں سے قطع نظر کر کے جو ابھی ایک مدت تک جاری رہیں گی جن کا فیصلہ جلد ہونا مشکل ہے۔ ہمیں اب کام کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔

اس کو کبھی نہیں بھولنا چاہیے کہ زبان خواہ کیسی ہی حقیر ہو، بولنے والوں کی زندگی سے، اندر اور باہر، ایسی لپٹی ہوتی ہے کہ وہ اس کا جزو لاینفک ہو جاتی ہے۔ زبان کی مخالفت بولنے والوں کی مخالفت ہے کیوں کہ ان کی زندگی کے تمام شعبوں یعنی سیاست، معاشرت، تہذیب و تمدن کا سرمایہ اسی میں محفوظ ہے۔ زبان کا جانا زندگی کا جانا ہے۔ زبان کے لیے دنیا میں بڑے بڑے فساد اور جنگیں ہوئی ہیں۔ میدان جنگ میں اور اس سے باہر بھی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آپ اس کے لیے جنگ کریں۔ لیکن اتنا ضرور کہتا ہوں کہ اگر آپ کو اپنی زندگی اور تہذیب عزیز ہے تو اس کے بچانے کی فکر کیجیے۔ جب میں کسی جماعت یا شخص سے اس قسم کا ذکر کرتا ہوں

تو وہ پوچھتے ہیں کہ ہم کیا کریں ؟ یہ سنتا ہوں تو میرے دل کو صدمہ ہوتا ہے۔
ہماری لاعلمی اور بے بسی کی یہ نوبت ہے کہ ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ کیا کرنا چاہیے
اس میں ان کا قصور نہیں۔ یہ ہمارے رہ نماؤں کا قصور ہے کہ وہ اپنے بھائیوں
کی صحیح رہ نمائی نہیں کرتے۔

لیکن اس کے علاوہ ایک بات اور بھی ہے کہ انسان اور خاص کر ہم بالطبع
کاہل واقع ہوئے ہیں۔ کام کرنے سے جی چراتے ہیں لیکن یہ یاد رہے کہ جو شخص یا
قوم کام کرنے سے جی چرائے اسے کبھی کام یابی اور آزادی حاصل نہیں ہو سکتی
کاہل اور کام چور کے نصیب میں غلامی لکھی ہے۔ افراد اور قوموں نے اپنی زبان
اور تہذیب کے بچانے کے لیے جانیں کھپا دی ہیں۔ ہم آپ سے یہ نہیں چاہتے
کہ جانیں دیں یا بڑی بڑی قربانیاں کریں ہم تو آپ سے صرف یہ چاہتے ہیں
کہ زیادہ نہیں تو تھوڑی سی توجہ اس طرف بھی فرمایئے۔ اگر احیاناً کبھی ضرورت
پڑے تو زیادہ نہیں تھوڑی سی زحمت اس کے لیئے بھی گوارا کیجیے۔ اگر کبھی اتفاق
سے کچھ خرچ کرنا پڑے تو زیادہ نہیں تو ایک قلیل و حقیر حصہ اپنی کمائی کا اس میں
بھی صرف کیجیے مگر یاد رکھیے کہ یہی ذرا سی توجہ یہی تھوڑی سی زحمت اور آپ کی
کمائی کا یہی قلیل اور حقیر حصہ آپ کی نجات کا باعث ہوگا۔

اس میں کوئی زحمت نہیں صرف توجہ کی ضرورت ہے۔ خطوں کے لفافوں
پر پتہ اردو میں لکھیں۔ جلسوں میں تقریریں اُردو میں کریں۔ اپنے جلسوں کی
روداد یں اُردو میں لکھیں۔ اپنے سائن بورڈ، اپنے نام کی تختیاں اُردو میں
ہوں۔ منی آرڈر اور رجسٹری کے فارم ڈاک خانے سے اُردو میں طلب کریں۔
اور اُردو ہی میں خانہ پُری کریں۔ اپنے گھروں اور عام بول چال میں اُردو
استعمال کریں۔ باہم خط و کتابت اُردو میں کی جائے اُردو اخبار اور رسالوں

کی سرپرستی کریں، اُردو کتابوں کا مطالعہ کریں، حساب کتاب اُردو میں رکھیں۔
یہ عام باتیں ہیں۔ اگرچہ معمولی ہیں مگر بہت ضروری ہیں۔ اس میں نہ زحمت ہے نہ خرچ صرف تھوڑی سی توجہ درکار ہے۔

اب میں ان امور کا ذکر کرتا ہوں جن میں کچھ زحمت بھی ہے اور کچھ خرچ بھی
۱۔ خانگی طور پر اُردو کے مدرسے اور مکتب قائم کیے جائیں۔
۲۔ بالغوں کی تعلیم کے لیے شبینہ مدرسے کھولے جائیں۔
۳۔ دینی مکتبوں میں اُردو کی تعلیم لازمی کر دی جائے۔
۴۔ لڑکیوں کو خاص طور پر اُردو کی تعلیم دلائی جائے۔
۵۔ جہاں جہاں ممکن ہو مطالعہ گھر قائم کیے جائیں۔
۶۔ اُردو کی اہمیت لوگوں کے ذہن نشین کی جائے اور انھیں اُردو اخباروں رسالوں اور کتابوں کے پڑھنے کی ترغیب دی جائے۔

آخر میں ان چند امور کا ذکر کرتا ہوں جن کا تعلق خاص طور پر آپ سے ہے۔
۱۔ ریاست میں اُردو کے تحفظ اور اس کی ترویج کے لیے ایک مستقل اور مضبوط انجمن ترقیٔ اُردو قائم کی جائے جس کی شاخیں ریاست بھر میں پھیلائی جائیں۔
۲۔ ریاست کو مشورہ دیا جائے کہ اُردو کے تحفظ اور اس کی ترقی کے لیے ایک خاص افسر کا تقرر کیا جائے۔
۳۔ نیز یہ درخواست کی جائے کہ اُردو کو بھی وہی درجہ دیا جائے جو ہندی کو حاصل ہے اور عدالتوں میں اُردو رسم الخط کی اجازت دی جائے۔
۴۔ اُردو کے کتب خانوں اور مدرسوں کے لیے ریاست سے امداد کی درخواست کی جائے۔

آپ کو شکر کرنا چاہیے کہ آپ ایک بیدار مغز اور روشن خیال فرماں روا کی

رعایا ہیں۔ جن کو اپنی رعایا کی بہبودی کا بہت خیال ہے۔ اگر آپ مناسب طریقے پر اپنی ضرورتوں کا اظہار کریں گے تو امید ہے کہ وہ ضرور لحاظ فرمائیں گے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ جب تک آپ کامیاب نہ ہوں برابر کوشش کرتے رہیں اور بار بار اپنی ضرورتیں اور شکایتیں پیش کرتے رہیں۔

آخر میں آپ سے صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جو کام آپ اپنے ہاتھ میں لیں اسے صبر و استقلال کے ساتھ برابر کرتے ہیں۔ ناکام یابی سے بددل اور مایوس نہ ہوں۔ انسانی کوشش بڑی زدست قوت ہے مگر شرط یہی ہے کہ استقلال میں فرق نہ آئے۔ پھر ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے۔
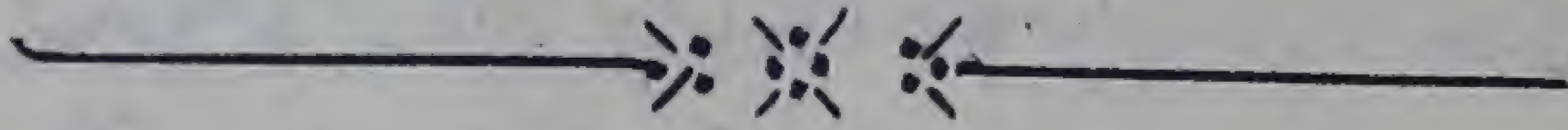
خطبۂ صدارت کُل پنجاب اُردو کانفرنس لائل پور

منعقدہ ۲۳ و ۲۴ فروری ۱۹۴۱ء

حضرات!

کانفرنس کرنا آج کل فیشن ہو گیا ہے، ہنگامہ پسندی اور تفریح کے لیے لوگوں کو اچھا نسخہ ہاتھ آ گیا ہے۔ اس قسم کی اردو کانفرنس میں مشاعرہ بھی ساتھ ساتھ ہوتا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ مشاعرے کے جواز کے لیے کانفرنس بھی کر لی جاتی ہے۔ مجھے بعض ایسی کانفرنسوں میں شرکت کا اتّفاق ہوا ہے اور ہمیشہ پچھتانا پڑا ہے۔ بے عملی کا یہ رنگ دیکھ کر میں کانفرنسوں سے بیزار ہو گیا ہوں اور جب کوئی میرے سامنے کانفرنس کا نام لیتا ہے یا اس میں شرکت کی دعوت دیتا ہے تو مجھے تکلیف سی محسوس ہوتی ہے۔ کسی شخص یا جماعت کو کانفرنس کرنے کا حق نہیں جب تک وہ کچھ کر کے نہ دکھائے۔ اگر عمل کا جذبہ نہیں ہے تو اس خیال ہی کو دل سے نکال دینا چاہیے۔ تفریح اور دل لگی کے لیے اور بہت سے سامان موجود ہیں انھیں کام میں لائیے۔ مگر خدا کے لیے کانفرنسوں کو کھیل تماشے کا ذریعہ نہ بنائیے۔ کانفرنس بہت باوقعت چیز ہے اسے بے وقعت نہ کیجیے اور جگ ہنسائی کا موقع نہ دیجیے۔

اشرف ریاض صاحب جب مجھ سے دلّی میں ملے اور انھوں نے لائل پور
میں کانفرنس کرنے کا خیال ظاہر کیا تو میں نے ان سے صاف صاف یہی کہا جو
میں نے ابھی آپ کی خدمت میں عرض کیا ہو ۔ یہ سُن کر انھوں نے مجھے کامل اطمینان
دلایا کہ ہماری کانفرنس بے معنی نہ ہوگی ۔ ہم حقیقی کام کرنا چاہتے ہیں اور ایسا کام
کریں گے کہ دوسروں کے لیے مثال ہوگا ۔ اس کے بعد میرے لیے انکار کی
کوئی گنجایش نہ رہی اور اب میں اس خیال اور امید کے ساتھ حاضر ہوا ہوں
کہ آپ کی کانفرنس جیسا کہ اشرف ریاض صاحب نے فرمایا تھا ۔ ایسا کام کر کے
دکھائے جو ہمارے مقصد کے لیے مفید ہوگا اور اپنے عمل سے کام کرنے کی
اچھی مثال پیش کرے گی ۔

حضرات — آج کل ہندستان میں اختلافات کا ایک طوفان بپا ہو۔
اور صوبوں کو جانے دیجیے ۔ آپ اپنے صوبے کو لیجیے ۔ زندگی کا کون سا ایسا
شعبہ ہو جس میں آپ کے ہاں اختلاف نہیں پایا جاتا ۔ کچھ زیادہ دن نہیں
ہوئے کہ میں نے اس بات پر بہت خوشی کا اظہار کیا تھا اور اہلِ پنجاب کو
مبارک باد دی تھی کہ آپ میں اختلافات ہوں تو ہوں لیکن لسانی اعتبار سے
آپ ایک ہیں ۔ ایسا معلوم ہوتا ہو کہ آپ کے دشمنوں کو یہ اتحاد پسند نہ آیا
اور انھوں نے زبان کے معاملے میں پھوٹ ڈالنی شروع کر دی ۔ اگر لڑنے
جھگڑنے ہی کا شوق تھا تو اس کے لیے بہت سے موقعے تھے ۔ خوب دل کھول کر
لڑ سکتے تھے لیکن ایک ایسی چیز کو ٹھیس لگانا جو ہمارے اتحاد کا صرف ایک ہی
ذریعہ رہ گئی ہو بڑے درجے کی ناعاقبت اندیشی اور نادانی ہو ۔ جب کبھی کوئی
ایسا جھگڑا ہم میں پیدا ہوتا ہو تو ہم اس کی کنہ تک پہنچنے کی کوشش نہیں کرتے ۔
ہم نے اس کے لیے ایک ضابطہ بنا رکھا ہو یعنی بڑی بے پروائی سے کہہ دیتے ہیں کہ

یہ سب "تیسری پارٹی" کا کیا دھرا ہے۔ گویا ہم بہت بھولے بھالے اور معصوم ہیں، تیسری پارٹی بڑی چالاک اور متفنّی ہے اور ہمیں لڑاتی رہتی ہے اور ہم لڑتے رہتے ہیں لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جب ہم یہ جانتے اور سمجھتے ہیں کہ ہمیں ایک تیسری پارٹی لڑاتی ہے تو ہم کیوں لڑتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ ہم اس حیلے سے اپنے عیب پر پردہ ڈال کر اپنی ذمہ داری کو ہلکا کرنا چاہتے ہیں لیکن ان حیلوں سے ہم اپنی ذمّے داری سے بری الذمّہ نہیں ہو سکتے۔

آپ کو معلوم ہے کہ مہاراجا رنجیت سنگھ کے زمانے میں پنجاب میں سرکاری زبان فارسی تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے جب پنجاب کو فتح کیا تو دوسرے علاقوں کی طرح یہاں کی زبان بھی اُردو ہو گئی اور تقریباً ایک صدی سے دفتروں، عدالتوں اور مدرسوں اور سرکاری دربار میں چھائی ہوئی ہے۔ سینکڑوں اخبار و رسالے اُردو میں نکلتے ہیں۔ خط و کتابت اُردو میں ہوتی ہے جتنی کتابیں یہاں اُردو میں شایع ہوتی ہیں کسی اور زبان میں نہیں ہوتیں۔ یہاں اُردو کے ایسے ایسے ادیب، شاعر اور مصنف ہوئے ہیں اور ہیں جن کا کلام بڑی وقعت اور شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ ہوتے ہوئے اب ایک صدی کے بعد ہندی کے ذریعے تعلیم ہونے کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ حالانکہ ہندی پنجاب کے کسی علاقے کی زبان نہیں ہے۔ آخر یہ کیوں؟ اس کی وجہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ یہ موجودہ زمانے کے حالات کا اثر ہے اور یہ حالات زیادہ تر سیاسی ہیں جن میں مذہبی جذبات بھی شریک ہو گئے ہیں اور اس طرح ایک آخری کڑی جو اتحاد کی رہ گئی ہے وہ ٹوٹتی نظر آتی ہے۔

ہم جو اُردو کو ملکی زبان کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں تو وہ سیاسی یا مذہبی جذبات سے متاثر ہو کر نہیں بلکہ اس اتحاد کی خاطر پیش کرتے ہیں جو آج کل

بے دردی سے روندا جا رہا ہے۔ باوجود گوناگوں اختلافات کے اس وقت بھی اسے یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس کے شیدائیوں میں ہر مذہب و ملت اور ہر فرقے اور ہر خیال کے لوگ ہیں۔ اس کے مقابلے میں کوئی دوسری ایسی زبان نہیں جسے یہ فضیلت ہو۔ یہ صدیوں کی کمائی ہے اور ہم سب کے اسلاف کی صدہا سال کی محنت اور مشقت اور مسلسل کوشش سے اس رتبے کو پہنچی ہے جو اسے حاصل ہے اسے کھو کر اور مٹا کر کسی ایسی زبان کو رائج کرنا جسے نہ یہ رتبہ حاصل ہے جو نہ کسی علاقے یا شہر یا دیہات کی بولی ہے، کہاں کی دانش مندی ہے؟ جو زبان بنی ہی اس لیے تھی کہ ہم سب مل کر اس میں بات چیت کریں، دنیوی کاروبار چلائیں علمی اور ادبی کام لیں۔ اس میں اب کون سا ایسا عیب پیدا ہو گیا ہے کہ اسے نکالنے اور اس کی جگہ زبردستی ایک نئی زبان گھڑ کر چلانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اگر ہم اسی طرح ہر عہد میں اپنے بزرگوں کی کمائی خاک میں ملا کر نئے گھروندے بناتے رہیں گے تو ہمارا کیا حال ہوگا۔ خصوصاً صوبہ پنجاب کو کون سی ایسی ضرورت داعی ہوئی تھی کہ یہ ہنگامہ برپا کیا جا رہا ہے۔ بعض اوقات لوگ جذبات سے اندھے ہو کر بے سوچے سمجھے ایسے کام کر گزرتے ہیں جو قوم کی تباہی کا باعث ہو جاتے ہیں۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ پنجاب میں — جو پہلے ہی اختلافات کا دنگل بنا ہوا ہے — فساد اور نفاق کا ایک اور محاذ تیار کیا جائے جس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ سوا خرابی اور رسوائی کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

وہ سیاسی جھگڑے جن کی لپیٹ میں ہماری زبان بھی آ گئی ہے ایسے نہیں کہ ان کا فیصلہ کبھی ہوگا ہی نہیں۔ ایک دن ضرور ایسا آئے گا جب غم و غصہ کی یہ آندھی جو آج کل چڑھی ہوئی ہے تھم جائے گی۔ لوگوں کے ہوش و حواس

ٹھکانے لگ جائیں گے تو وہ اپنی غلطیوں اور کج فہمیوں پر پچھتا کر سر جوڑ کر بیٹھیں گے اور ساری گتھیوں کو آناً فاناً میں سلجھا لیں گے۔ لیکن اگر ہم نے زبان کے معاملے میں پیچیدگیاں پیدا کر دیں اور اپنی موجودہ روش کو نہ بدلا تو سارے فیصلے اور سمجھوتے دھرے کے دھرے رہ جائیں گے اور کچھ بنائے نہ بن پڑے گی۔ اس لیے دانش مندی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم زبان کو سیاسی اور مذہبی جھگڑوں سے پاک صاف رکھیں ورنہ بیچ میں ایک ایسی رکاوٹ پیدا ہو جائے گی کہ معاملہ سنبھالے نہ سنبھلے گا اور ساری کوششیں اکارت ہو جائیں گی۔

ایک بڑی غلطی بلکہ کوتاہ فہمی اس معاملے میں یہ ہوئی کہ زبان کے نادان دوستوں نے زبان کے مسئلے کو ہندو مسلم سوال بنا لیا۔ اس بدنصیب ملک میں ہر چیز ہندو مسلم ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ چائے اور پانی بھی ہندو مسلمان ہو گئے ہیں۔ یہی حال آج کل زبان کا ہے۔ لیکن افسوس اور سخت افسوس اس وقت ہوتا ہے جب یہ اختلاف اس زبان کے متعلق کیا جاتا ہے جس میں ہندو مسلمان دونوں برابر کے شریک ہیں۔ جو دونوں میں مقبول اور دونوں میں محبوب رہی ہے اور جو ان دونوں کی شرکت اور اتحاد کے بغیر وجود ہی میں نہیں آ سکتی تھی اور بہ قولِ سر تیج بہادر سپرو ہندو مسلمانوں کی ناقابلِ تقسیم وراثت ہے۔ اب یہ مقبول اور محبوب زبان کیوں مردود ہے؟ اس کا سبب ابھی بیان کر چکا ہوں۔ اس میں عوام کا قصور نہیں۔ قصور ہے تو ہمارے لیڈروں کا جن کے ہاتھ میں ملک کی رہ نمائی ہے سیاسی اغراض زندگی کے ہر شعبے میں چھائے ہوئے ہیں اور انصاف اور خلوص کی بجائے سیاست کاری سے کام لیا جاتا ہے اور سیاست کاری وہ بس کی گانٹھ ہے جو سارے فسادوں کی جڑ ہے۔ ہمارے سیاسی بزرگ سب کچھ کہتے ہیں

لیکن ان کی باتوں میں لفظ زیادہ معنی کم ہوتے ہیں۔ صاف بات کبھی نہیں کہتے۔ آدھی بات ان کے دل میں ہوتی ہے اور آدھی زبان پر۔ اور اکثر ایسی زبان میں تحریر و تقریر فرماتے ہیں کہ وقت پر اپنے مطلب کے موافق معنی پیدا کر سکیں۔ آپ نے سمپورنا نندجی کا خطبہ ملاحظہ کیا ہوگا جو پچھلے دسمبر میں آل انڈیا ہندی سمیلن کے سالانہ اجلاس میں پڑھا گیا تھا۔ اس میں انھوں نے اس خط و کتابت کا بھی ذکر کیا ہے جو ان میں اور گاندھی جی میں ہوئی تھی۔ گاندھی جی ان کے جواب میں ہندستانی کے متعلق یہ لکھتے ہیں کہ کانگریس نے بھاشا کا نام رکھا ہے اور کوئی قید نہیں لگائی۔ اب آپ ہی انصاف کیجیے کہ اس کے کیا معنی ہوئے۔ بھاشا کا نام تو رکھ دیا لیکن جس بھاشا کا یہ نام رکھا ہے اس کی کوئی تصریح نہیں۔ یعنی یہ ایک اسم ہے بلا مسمیٰ۔ لطف یہ ہے کہ ہندستانی کا رزولیوشن خود گاندھی جی نے اپنے قلم سے لکھ کر دیا تھا اور وہی کانگریس میں منظور ہوا۔ "کوئی قید نہیں لگائی" کا فقرہ بہت پُر معنی ہے۔ یعنی جب زبان کا معاملہ پیش ہوگا اور بحث آئے گی تو اپنے مطلب کے موافق معنی پہنا دیے جائیں گے۔ اس وقت آدھی بات جو دل میں تھی زبان پر آئے گی۔ جب بڑے بڑے مہاتماؤں کا یہ حال ہے تو ہم سے گنہگار کس گنتی میں ہیں۔ یہی حال ہم آج کل پنجاب میں دیکھ رہے ہیں۔ ایک معاملے کے متعلق مختلف اخباروں میں مختلف بیان شائع ہوتے ہیں۔ ایک کچھ کہتا ہے اور دوسرا کچھ اور حکومت کچھ اور ہی کہتی ہے۔ خلوت میں کچھ ہے اور جلوت میں کچھ۔ بالمشافہ ایک بات اور تحریر میں دوسری، وہی آدھی بات دل میں اور آدھی

زبان پر۔ یہ سیاسی ہتھکنڈے کب تک کام دیں گے۔ یقیناً ایک دن ان کا بھرم کھل جائے گا۔

یہ وہ باتیں ہیں جو روزانہ ہمارے سامنے آتی ہیں اور ہم ان پر افسوس کرتے ہیں۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے کہ ہر بات میں اختلاف اور ہر معاملے میں پھوٹ۔ ان حالات میں آپ انجمنِ ترقیٔ اردو کو غنیمت سمجھیے کہ اس نے اس چیز کو لیا ہے جو ہندستانی تہذیب و تمدن کی (یعنی اس تمدن کی جو ہندو مسلمانوں کے ساجھے سے بنا ہو) سب سے بڑی نشانی ہے۔ ہماری تاریخیں راجاؤں اور بادشاہوں کے جاہ و جلال، درباروں کی شان و شوکت، لشکر کشی اور جنگ و جدل سے بھری پڑی ہیں۔ لیکن ان تاریخوں میں نہیں ملتیں تو وہ چیزیں جو زندگی کی جان ہیں۔ گزشتہ صدیوں میں ہم نے ایرانی ہندی تہذیبوں کو سمو کر ایک ایسے عجیب اور خوش نما تمدن کی بنیاد ڈالی جس کا اثر اب تک ہمارے رہنے، سہنے، کھانے پینے، لباس، صناعی، بول چال، غرض زندگی کے ہر شعبے میں پایا جاتا ہے اور اس تمدن کی سب سے عظیم الشان اور باوقعت یادگار ہماری وہ زبان ہے جو اُردو کے نام سے ہندستان بھر میں پائی جاتی ہے۔ انجمن ترقیٔ اُردو کا مقصد اس یادگار کو قائم رکھنا اور ترقی دینا ہے۔

انجمن نے اس خصوصیت کو قائم رکھا ہے جو اُردو کی اصلی اور بنیادی خصوصیت ہے۔ جس طرح یہ زبان آپس کے میل جول سے بنی اور کسی خاص فرقے کی نہیں اسی طرح انجمن بھی خاص فرقے کی نہیں اس کے ارکان، سرپرستوں اور ہمدردوں میں ہر جماعت، ہر فرقے،

ہر قوم و ملت ، ہر خیال اور ہر رنگ کے لوگ شریک ہیں ۔ اس لیے آپ سے درخواست ہے کہ آپ ہماری اس کام میں مدد کریں۔ انجمن کو مضبوط بنائیں ۔ اس کی شاخیں ملک بھر میں قائم کریں اور اس کا پیغام گھر گھر پہنچائیں اور اس عزیز یادگار کو عزیز تر بنائیں اور اس کی بدولت پھر اسی یک جہتی اور اتحاد کا سماں پیدا کریں جس کے دیکھنے کو ہماری آنکھیں ترستی ہیں ۔

نہال دشمنی برکن کہ رنج بے شمار آرد
درختِ دوستی بنشاں کہ کامِ دل ببار آرد

خطبۂ صدارت یومِ اُردو انجمن حمایت اسلام۔ لاہور

۱۲ر اپریل ۱۹۴۱ء

آپ کی انجمن نے چند سال سے اپنے سالانہ جلسے کے پروگرام میں اُردو کے لیے بھی ایک دن رکھا ہے۔ یہ بہت مبارک خیال ہے۔ آپ کا صوبہ تقریباً سو سال سے اُردو زبان کی پرورش اور خدمت کر رہا ہے۔ اور اس کے ذریعہ سے اس نے وہ کام کیا ہے جو ہندوستان کے کسی دوسرے صوبے کو نصیب نہیں ہوا۔ یعنی اس نے اپنی وسیع قلمرو میں لسانی اتحاد پیدا کر دیا ہے۔ اس کی سچی قدر ہمیں اب ہوئی ہے۔ جب کہ دوسرے صوبے اختلاف اور افتراق بڑھا رہے تھے، آپ اختلاف مٹا کر اتحاد پھیلا رہے تھے۔ جب کہ دوسرے صوبے ہماری تہذیب اور زبان کی جڑیں کھوکھلی کر رہے تھے۔ آپ ان کی بنیاد اور مستحکم کر رہے تھے۔ یہ معمولی کام نہ تھا۔ آپ نے اور آپ کے اسلاف نے اس مہم کے سر کرنے میں جو محنت اور مشقت اور جاں کاہی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ جو قربانیاں کی ہیں وہ کسی حال میں بھلائی نہیں جاسکتیں۔

لیکن بدقسمتی سے ایسا زمانہ آگیا ہی کہ اب اس کی ترقی کا اتنا فکر نہیں جتنا اس کی حفاظت اور مدافعت کا ہی۔ ہمارا حال اس وقت اس شخص کا سا ہی جسے کتابوں کے نادر اور قلمی نسخوں کے جمع کرنے کی دُھن ہوتی ہی۔ وہ جگہ جگہ مارا مارا پھرتا ہی اور طرح طرح کی صعوبتیں جھیلتا ہی اور جہاں کہیں کسی نادر نسخے کا سُراغ لگتا ہی، فوراً وہاں پہنچتا ہی۔ خوشامد سے، حیلے سے، رُپیہ پیسہ صرف کرکے اسے حاصل کرتا ہی۔ اس طرح زندگی کا بڑا حصّہ اور عمر بھر کی کمائی اس میں لگا دیتا ہی۔ جب ایک مدت کے بعد ایک بیش بہا اور بڑا ذخیرہ جمع کرلیتا ہی تو اُسے دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا ہی اور پھولا نہیں سماتا۔ لیکن معاً اسے ایک دوسرا فکر لاحق ہوجاتا ہی وہ سوچتا ہی کہ اس انمول خزانے کا جمع کرنا بیشک بہت کٹھن اور دشوار تھا اور میں اس دشواری پر غالب آگیا لیکن اب اس کی حفاظت اس سے کہیں زیادہ دشوار ہی۔ گرد و غبار، آب و ہوا کے اثر، کیڑوں اور دیمک کی یورش اور شریف چوروں کی نظر بد سے اس کا بچانا آسان نہیں۔ اب باقی عمر ان سب کے مقابلے اور مدافعت میں بسر کرنی ہوگی۔ اس خیال سے اس کی خوشی آدھی رہ جاتی ہی۔ یہی حال اب ہمارا ہی۔ سالہا سال نسلاً بعد نسلٍ ہم نے اپنی زبان کی نشو و نما اور اشاعت و ترقی میں کوشش کی اور عین اس وقت جب کہ ہم اسے علم و ادب سے اور زیادہ مالا مال کرنا چاہتے تھے، ہمیں اس کے بچاؤ کی پڑگئی۔ بچاؤ بھی کس سے؟ اُن سے جو اس کی پرورش اور ترقی میں برابر کے شریک تھے۔

غیر سے مقابلہ اتنا مشکل نہیں ہوتا جتنا اپنوں سے۔ اور یہ سخت سانحہ ہے۔ اس سے ملک میں ہیجان پیدا ہوگیا ہے، تعلقات میں فرق آگیا ہے اور اختلاف کا ایک ایسا سوتا کھل گیا ہے جو بند ہوتا نظر نہیں آتا۔

اے اہلِ پنجاب! ہم آپ کی طرف سے مطمئن تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ اور صوبوں میں کچھ بھی ہو مگر آپ اس غیر معقول شورش سے محفوظ ہیں کیوں کہ آپ نے مدت دراز کی کوشش سے ایسا لسانی اتحاد پیدا کرلیا ہے کہ وہ معمولی مخالفتوں سے نہیں ٹوٹ سکتا۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ وہ آندھی جو آپ کے پڑوسی صوبوں میں زور شور سے چل رہی ہے اس کی سرسراہٹ یہاں بھی محسوس ہو رہی ہے۔ مگر مجھے یقین ہے کہ آپ اپنے فطری استقلال اور ہمت سے اس کے روکنے کے لیے سینہ سپر ہو جائیں گے اور اس طوفان بے تمیزی کو اپنے صوبے میں داخل نہ ہونے دیں گے۔

اس مہینے کے ایک مشہور ہندی رسالے میں جو بنارس سے شایع ہوتا ہے ایک مضمون پنجاب کے ہندی اُردو جھگڑے کے متعلق نکلا ہے۔ پنجاب کے متعلق اس میں وہی باتیں ہیں جو آپ بار بار اخباروں میں پڑھ چکے ہیں اور ان کا اعادہ فضول ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ پنجاب میں ہندی کوئی زبان ہی نہیں اور اس لیے اس پر بحث کرنا ہی غیر ضروری ہے۔ ریاست ٹراونکور میں بھی یہی واقعہ پیش آیا۔ وہاں بھی ہندی کے حامیوں نے حکومت پر زور ڈالا کہ

ہندی مدارس میں رائج کی جائے ۔ حکومت نے صاف جواب دے دیا کہ ہندی یہاں کی زبان نہیں ۔ اس لیے داخلِ نصاب نہیں کی جا سکتی ۔ یہ تو ہوا پنجاب کے متعلق ۔ لیکن اس مضمون میں مضمون نگار نے عجیب منطق سے کام لیا ہے وہ لکھتا ہے کہ ہندستان میں مسلمانوں کی آبادی نو کروڑ بتائی جاتی ہے ۔ ان میں اُردو بولنے والوں کی تعداد صرف لاکھوں کے اندر ہے کیوں کہ عربی، فارسی یا اُردو پڑھے لکھے مسلمان زیادہ تر شہروں میں رہتے ہیں اور دیہات کے مسلمان سب ہندی بولتے ہیں ۔ اس سے کئی نتیجے نکلتے ہیں ۔ ایک تو یہ کہ اُردو مسلمانوں کی زبان ہے دوسرا یہ کہ صرف شہروں کے مسلمانوں کی زبان ہے اور تیسرا یہ کہ باقی تمام آبادی کی زبان جس میں ہندو مسلمان دونوں شریک ہیں، ہندی ہے ۔

ہندی والوں نے عجب تماشا کر رکھا ہے ۔ پہلے تو انھوں نے یہ الزام دینا شروع کیا کہ مسلمان اُردو کو مسلمانوں کی زبان کہتے ہیں اور اس پر بہت غم و غصّہ کا اظہار کیا ۔ چوں کہ سراسر بہتان تھا اس کا کچھ اثر نہ ہوا ۔ اس کے بعد دوسری چال یہ تھی کہ خود ہی یہ کہنا شروع کیا کہ اُردو مسلمانوں کی زبان ہے اور ہندی ہندوؤں کی۔ چناں چہ اس رسالے کے اسی مضمون میں لکھا ہے کہ "بدقسمتی سے ہندی ہندوؤں کی اور اُردو مسلمانوں کی زبان سمجھی جانے لگی ہے"۔ جب یہ بھی کافی نہ ہوا تو ایک نیا شگوفہ یہ چھوڑا گیا ہے کہ اُردو صرف شہروں کے چند لاکھ مسلمانوں کی زبان ہے، باقی ملک کی زبان ہندی ہے۔ آج کل پروپیگنڈے کا زمانہ ہے اور پروپیگنڈے میں ہر قسم کی غلط بیانی

جائز سمجھی گئی ہے - ان باتوں کی تردید کرنا تضیعِ اوقات ہے - میں اُن سے صرف ایک سوال کرنا چاہتا ہوں کہ جب انگریزی عہد میں فارسی کی جگہ اُردو عدالتی، دفتری اور تعلیمی زبان قرار دی گئی تو اس وقت یہ صاحب (ہندی) [زادے] کہاں تھیں؟ اس وقت کوئی منہ سے نہ پھوٹا کہ اُردو نہیں ہندی ہونی چاہیے - اور کہتا کس منہ سے کوئی زبان ہوتی بھی -

اب آپ ہندی کی حقیقت سُنیے - ہندی کوئی ایک زبان نہیں - ہر صوبے اور علاقے اور مختلف اضلاع میں الگ الگ ہے - میرٹھ اور دہلی کے دیہات کا آدمی اودھ کے دیہات کی بولی نہیں سمجھ سکتا اور اودھ کے دیہات والے کے لیے بہار کے دیہات کی بولی ناقابلِ فہم ہے - بہار کے ایک علاقے کا دیہاتی دوسرے علاقے کے دیہاتی کی زبان سمجھنے سے قاصر ہے - غرض آگرہ اور متھرا کے دیہات کی بولی سمجھنے کے لیے برج بھاشا، اودھ کے دیہات کے لیے اودھی یا پوربی، حصار، رہتک کے لیے ہریانی بھگیلکھنڈ (سنٹرل انڈیا) کے لیے بھگیلی، کان پور، فتح گڑھ، اٹاوہ، بریلی، علی گڑھ کے دیہات کے لیے قنوجی؛ بنارس، غازی پور، آرہ کے لیے بھوج پوری؛ بندھیلکھنڈ کے لیے بندھیلکھنڈی؛ مالوہ کے لیے ہروتی؛ اُجین کے لیے اُجینی؛ مارواڑ کے لیے مارواڑی؛ بیکانیر کے لیے بیکانیری؛ بہار اور پٹنہ کے دیہات کے لیے مگدھی؛ اودے پور کے لیے اودے پوری؛ جے پور کے لیے جے پوری؛ بھٹانیر کے لیے بھٹانیری؛ ترہٹ، پورنیہ، بھاگلپور اور مونگیر کے لیے ترہتی اور میتھلی جاننے کی ضرورت ہے -

اب اس پر یہ دعوا کہاں تک معقول ہوسکتا ہی کہ ہندی سب دیہات میں سمجھی جاتی ہی اور اُردو کہیں نہیں سمجھی جاتی۔ ان کی مراد کون سی ہندی سے ہی؟ غالباً ان کی مراد اس نئی مصنوعی ہندی سے ہی جو حال میں گھڑی گئی ہی اور وہ بھی اُردو کے طفیل میں اور اُسی کے قالب .... پر ڈھال کر۔ اور بنی تو ایسی کہ وہ نہ دیہاتی رہی نہ شہری۔ گاندھی جی نے اس ہندی کی بہت صحیح تعریف کی ہی کہ یہ وہ زبان ہی جو کتابوں میں ہی اور بول چال میں نہیں۔ اب اسی سے اندازہ کر لیجیے کہ وہ کہاں سمجھی جا سکتی ہی۔ برخلاف اس کے اُردو کتابی زبان بھی ہی اور بول چال کی بھی اور اس لیے ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہی۔ ہم نے اُن دیہاتی جلسوں کو بھی دیکھا ہی جہاں اُردو اور اس نئی ہندی دونوں کے مقرر تھے۔ جب ہندی مقرر نے اپنی نئی ہندی میں تقریر شروع کی تو دیہاتیوں نے حقے گڑگڑانے شروع کر دیے؛ برخلاف اس کے اُردو کی تقریر انھوں نے خاصی توجہ سے سُنی۔ ہم نے اُردو اور ہندی کے مشاعرے بھی دیکھے ہیں اور جن صاحبوں کو ان کے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہی انھیں معلوم ہی کہ اُردو مشاعروں میں جتنی رونق اور چہل پہل ہوتی ہی کوی سمیلنوں میں اتنی ہی بے رونقی اور اداسی چھائی ہوئی ہوتی ہی۔ اس کی وجہ ہندی اور اُردو کے مشہور ادیب پنڈت پدم سنگھ شرما مرحوم نے آل انڈیا ہندی ساہتیہ سمیلن مظفر پور کی تقریر میں بیان کی ہی جو یہ ہی:-

"اُردو شعرا نے حالی کے رنگ کو اپنا لیا ہی بلکہ اُسے

اور چمکا دیا ہے۔ اُردو اخبارات میں دیس بھگتی (حب وطن) اور معرفت کی جو نظمیں نکلتی ہیں وہ پڑھنے والے ۔ ۔ ۔ کو اپنی طرف کھینچتی ہیں، دل پر اثر کرتی ہیں۔ بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ ہندی کی نئی رچناؤں (نظموں) میں یہ بات ابھی نہیں آئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اُردو والے شعروں میں جذبات و خیالات کا میاپن بھرتے ہیں"۔

خیر سے، اس پر یہ دعوا ہے کہ ہندی سارے ملک کی زبان ہے اور اس کے حامی اسے پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ، ملیبار وغیرہ میں پھیلانے کا دم خم رکھتے ہیں۔ ہندی اُردو کی بحث میں صرف ایک بات کا یاد رکھنا کافی ہے۔ہندی بیسیوں ہیں اور اُردو ایک ہے جو ہندستان کے ہر علاقے میں بولی یا سمجھی جاتی ہے۔ بلکہ ہندستان کے باہر بھی اس کے قدردان موجود ہیں۔ اس نے براعظم ہندستان کو جو ٹکڑوں میں بٹا ہوا تھا ایک کر دیا اور سب سے پہلے ایک قومیت کی بنیاد ڈالی اور ہندی کی بھونڈی بولیوں کو ملا کر جھاڑ جھنکاڑ کو چھانٹا، مشترک حصّے کو قائم رکھا اور باہر کے خوب صورت، ضروری اور تمدنی الفاظ کا اس میں اضافہ کیا، جس سے ایک ایسی مہذب اور پاکیزہ زبان وجود میں آگئی جو نہ صرف ہندستان بلکہ دنیا کی تاریخ میں ایک عجیب واقعہ ہے۔ ایک ایسی شائستہ، لچک دار، پُرلطف اور بھر پور زبان کو چھوڑ کر ایک ان گھڑ، کرخت، بےلطف اور بلغوبا بولی کے اختیار کرنے کی رائے دینا سراسر ناعاقبت اندیشی اور مجنونانہ فعل ہے۔

یہ سب جانتے ہیں اور موافق، مخالف، غیر جانب دار

سب نے اسے تسلیم کیا ہے کہ اُردو زبان ہندو مسلمانوں کے میل جول سے بنی اور ہمارے ملک کی مشترکہ زبان ہے۔ لیکن اب ہمارے نئے قوم پرست اس سے بُرا مانتے ہیں۔ چناں چہ پنڈت سمپورنا نند جی اپنے پونا والے صدارتی خطبے میں ارشاد فرماتے ہیں:۔

"بار بار یہ کہا جاتا ہے کہ کم سے کم یکت پرانت (صوبہ متحدہ) کی ماتر بھاشا (مادری زبان) تو اُردو ہے۔ میں اسے نہیں مان سکتا۔ ہمارے سامنے کچھ ہندو مورتیاں کھڑی کر دی جاتی ہیں اور اُن کے منہ سے یہ کہلا دیا جاتا ہے کہ اُن کے گھروں کی بھاشا اُردو ہے۔"

کس قدر افسوس کی بات ہے کہ پنڈت جی نے ان نیک نفس اور سچے لوگوں کی جو باوجود مخالفت اور سوسائٹی کے دباؤ کے سچ بولنے میں دریغ نہیں کرتے۔ نہایت رکیک الفاظ میں تحقیر اور توہین کی ہے اور ان کو ریاکار اور منافق ہونے کا الزام دیا ہے حالاں کہ اُن میں ایسے ایسے بزرگ ہیں جو اخلاقی جرأت، علم و فضل اور شرافت نفس میں سمپورنا نند جی سے کہیں برتر اور افضل ہیں۔ پنڈت جی کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ گو اُن کے باپ دادا اُردو بولتے آئے ہوں اور گو ان کے گھروں میں اُردو بولی جاتی ہو اور خود اُردو بولتے ہوں لیکن کہنے کو یہی کہیں کہ ہماری "ماتر بھاشا" ہندی ہے اُردو نہیں۔ ریاکاری یہ ہے یا وہ۔ کون نہیں جانتا کہ ہزاروں نہیں لاکھوں ہندوؤں کے گھروں میں اُردو بولی جاتی ہے لیکن سمپورنا نند جی اور ان کے ہم خیال اصحاب کو ہرگز یہ گوارا نہیں کہ کوئی ہندو یہ کہے کہ

میری مادری زبان اُردو ہے یا میرے گھر میں اُردو بولی جاتی ہے۔ یہ اُس شخص کا قول ہے جو ہمارے ملک کا ممتاز لیڈر ہے، انڈین نیشنل کانگریس کا رکنِ رکین ہے، صاحبِ علم ہے اور کچھ دنوں پہلے وزیرِ تعلیم رہ چکا ہے۔ وہ اوروں کو بھی اپنا ہی سا سمجھتا ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے:۔

ایھوں نے بارہا شکلیں کبھی دیکھیں نہیں شاید
وہ جب آئینہ دیکھیں گے تو ہم بتلائیں گے ان کو

آپ نے ہندی کی حقیقت سُن لی اور اس کے حامیوں کے دعوے بھی سُن لیے۔ اصل یہ ہے کہ یہ ہندی بولیاں، گیتوں، بھجنوں، عشقیہ بیتوں کے لیے خوب تھیں۔ تہذیب و تمدن کی ضروریات اُن سے پوری نہیں ہو سکتی تھیں۔ ایک ایسی تہذیب اور تمدن کی ضروریات کے لیے جو دونوں قوموں کی یک جائی اور یگانگت، محبت اور خلوص سے پیدا ہوا تھا۔ ایک ایسی ہی زبان کی ضرورت تھی جو دونوں کی زبانوں اور دونوں کی تہذیبوں سے مل کر بنی ہو۔ چناں چہ وہی ہوا جو فطرت کا تقاضا تھا اور اس زبان کا چلن اب تک ہے۔ لیکن ملک کی بدقسمتی کہ انگریزی تسلط کے بعد بعض اسباب کی بنا پر جن کی تفصیل کی ضرورت نہیں، ہندی والوں کو ایک نئی قومیت کی سوجھی جس کی بنیاد قدیم تہذیب اور قدیم مذہب اور زبان پر تھی۔ اس نئی قومیت کے لیے نئی زبان کی ضرورت داعی ہوئی کیوں کہ قومیت کا رشتہ زبان ہی سے مضبوط ہوتا ہے۔ اب انھوں نے اُن علاقوں میں جہاں ہندی بولیاں رائج تھیں، ایک نئی مصنوعی ہندی کو رفتہ رفتہ داخل کرنا شروع کیا اور اُردو کو وہاں سے نکالنے کی تدبیریں

کرنے لگے۔ ملک میں تفرقہ پردازی بلکہ خانہ براندازی کا آغاز یہیں
سے ہوتا ہے۔

اوّل اوّل یہ مخالفت یو۔پی اور بہار تک محدود رہی کیوں کہ
ہندی بولیاں صرف یہیں بولی جاتی تھیں۔ دوسرے علاقوں اور
صوبوں میں نہ کہیں بولی جاتی تھیں اور نہ سمجھی جاتی تھیں۔ شروع
شروع میں یہ مخالفت کچھ زیادہ کارگر نہ ہوئی۔ یوں سمجھیے کہ جیسے کسی
تالاب پر ہوا چلتی ہے تو کچھ لہریں اور بُلبلے پیدا ہو جاتے ہیں،
کبھی کبھی تلاطم بھی آیا، پر وہ بھی کچھ دیر کے بعد ہَوا ہو گیا۔ لیکن
کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہونا کہ اس میدانِ کارزار میں ایک مقدّس
ہستی نمودار ہوئی جس نے صورتِ حال کی کایا پلٹ کر دی۔

ملک پر اس بزرگوار کے بہت احسان ہیں۔ اس نے سیاسات،
معاشرت، اقتصادیات میں بڑا انقلاب کر دیا۔ قدرت نے اُسے
خاص قسم کا دماغ عطا کیا ہے۔ اس کا ذہن رسا، اس کی نظر
دور بین اور اس کا ارادہ اٹل ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی
فکر کا راستہ گو بہ ظاہر صاف اور سیدھا ہے لیکن بباطن پیچ
در پیچ ہے۔ وہ اتفاق آباد جانے کا عزم کرتا ہے تو چلتے چلتے
نفاق نگر پر جا نکلتا ہے۔ وہ وصل کا طالب ہے لیکن داخل ہوتا ہے
فصل کے دروازے سے۔ وہ ایکے کا آرزو مند ہے لیکن وہاں تک
پہنچتا ہے پھوٹ کے توسل سے۔ میں کسی کی نیت پر حملہ کرنا نہیں
چاہتا۔ دلوں کا جاننے والا خدا ہے۔ لیکن جس طرح درخت اپنے
پھل سے پہچانا جاتا ہے انسان اپنے اعمال سے جانا جاتا ہے۔

اور یہ واقعہ ہی کہ جب کبھی ایسا موقع آیا کہ سالہا سال کی گتھیاں اور پیچیدہ مسائل فریقین نے باہمی مشورے اور مصالحت سے سلجھا لیے اور یہ امید بندھ گئی کہ اب نفاق کی گھٹا چھٹنے والی ہی اور آفتاب اتحاد اُفق سے طلوع ہونے والا ہی، تو تنت پر اس مقدس ہستی نے سر ہلاکر برسوں کی محنت خاک میں ملادی۔ پھر بہتیرا سر مارا، ہزار جتن کیے، نہ ماننا تھا نہ مانا۔

ہمارے ملک میں تین ہٹیں مشہور ہیں۔ راج ہٹ، تریا ہٹ، اور بالک ہٹ۔ لیکن حضرات، ایک چوتھی ہٹ اور بھی ہی، اور وہ ہی — لیڈر ہٹ۔ وہ لیڈر ہی کیا جو دوسرے کی مان جائے۔ مرزا داغ نے اپنے خاص انداز میں ایک بہت ہی پُر لطف اور صاف ستھرا شعر کہا ہی۔ کہا تو ہے اپنے محبوب کی شان میں لیکن صادق آتا ہی ہمارے ملک کے سب سے محبوب ڈکٹیٹر لیڈر پرے

اتنی ہی تو بس کسر ہی تم میں
کہنا نہیں مانتے کسی کا

مشکل یہ آپڑی ہی کہ وہ ہر مسئلے کو ایک آنکھ سے دیکھتا ہی جس سے ایک ہی رُخ نظر آتا ہی یا دوسرا رُخ نہ دیکھتا ہی اور نہ اُس کی اُسے پروا ہی اگر کوئی شخص کانا ہو اور وہ ایک آنکھ سے دیکھے وہ قابلِ الزام نہیں لیکن جس کی اچھی خاصی دو آنکھیں ہوں اور وہ ایک ہی آنکھ سے دیکھے تو وہ بلا شبہہ قابلِ الزام ہی

اس طرزِ عمل سے ملک کو سخت نقصان پہنچا ہی۔ اور باتوں سے تو خیر مجھے کوئی غرض نہیں وہ بڑی طولانی داستان ہی لیکن ہماری

زبان پر جو کاری ضرب اس نے لگائی ہے اس کا زخم ایسا گہرا ہے کہ اس کا بھرنا اب خود اس کے بس کی بات نہیں رہی ۔ آج تک کسی نے ہماری زبان پر ایسا بے جا ، غلط اور دل آزار حملہ نہیں کیا تھا ، جیسا اس مقدس بزرگ نے کیا ۔ اس کی دور بین نظر نے بہت پہلے یہ دیکھ لیا تھا کہ ہندستان کی موجودہ حکومت رہنے والی نہیں ہے اور رہی تو اس کی یہ صورت نہیں ہوگی ۔ وہ رام راج کے میٹھے سپنے دیکھ رہا تھا اور ظاہر ہے کہ رام راج کی زبان ہندی ہی ہوسکتی ہے اُردو نہیں ہوسکتی ۔ اس لیے اس نے ہندی کی اشاعت کو نصب العین بنایا ۔ اس مسئلے میں اس کا ہاتھ ڈالنا تھا کہ ملک میں اِس سرے سے اُس سرے تک ہل چل مچ گئی اور ایک نئے فساد کی بنیاد قائم ہوگئی جو دن بدن بڑھتا اور پھیلتا جاتا ہے ۔ سیاسی مسائل جن کو آج کل اس قدر اہمیت دی جاتی ہے اس کے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتے ۔ سیاسیات سے ہر ایک کو دلچسپی نہیں ہوتی اور نہ ہر شخص سیاسی مسائل سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن زبان کی بات اور ہے ۔ اس کا تعلق چھوٹے بڑے ، امیر غریب ، عالم ، عامی سب سے یکساں ہے ۔ وہ ان کے جسم و جان کا جزو ہے جو کسی حال میں اُن سے جدا نہیں ہوسکتا ۔ زبان پر جو چوٹ پڑتی ہے وہ زبان پر نہیں پڑتی ، دلوں پر پڑتی ہے اور چوٹ کھائے ہوئے دلوں سے ڈرنا چاہیے ۔

حذر کرو مرے دل سے کہ اس میں آگ بھری ہے

سیاسی مسائل خواہ کتنے ہی اہم اور کیسے ہی ضروری کیوں نہ ہوں کبھی خاطر خواہ حل نہ ہوں گے جب تک زبان کا مسئلہ حل نہ ہوگا ۔

افسوس اس کا ہے کہ یہ فساد وہاں سے پھوٹا جہاں ملک بھر کے مسائل حل ہوتے ہیں اور یہ زہر اُس زبان سے نکلا جو سب سے زیادہ نرم اور سب سے زیادہ دل لبھانے والی ہے۔

حضرات۔ آج کل ہندستان کی تقسیم کے متعلق اخباروں میں بڑی گرم اور تند و تلخ بحثیں ہو رہی ہیں۔ میں نے کبھی سیاست میں دخل نہیں دیا اور نہ میں اس کی صلاحیت رکھتا ہوں اس لیے مجھے اس کے عیب و صواب پر بحث کرنے کا کوئی حق نہیں لیکن حیرت اس بات پر ہے کہ جو لوگ جغرافی تقسیم پر اس قدر غم و غصّہ کا اظہار فرماتے ہیں انھوں نے کبھی دلوں کی تقسیم کا بھی خیال کیا ہے؟ دلوں کو توڑ کر انھیں جغرافی حدود سے جوڑنا سعی لاحاصل ہے۔ کیا وہ دل جن میں پھوٹ پڑ چکی ہے، پہاڑوں، دریاؤں اور جنگلوں سے گھیر کر ایک کیے جا سکتے ہیں؟ اگر دل ایک ہیں تو ایک نہیں بیس تقسیمیں بھی نقصان نہیں پہنچا سکتیں۔ لیکن اگر دل ایک نہیں تو جغرافی حدود کے تعین کی بہتر سے بہتر تجویز بھی انھیں ایک نہیں کر سکتی۔ اس لیے جو لوگ ملک کے سچے بہی خواہ ہیں اُنھیں ملک کی تقسیم پر بحث کرنے سے پہلے دلوں کی تقسیم پر بھی غور کر لینا چاہیے اور اس پر غور کرتے وقت سب سے پہلے زبان کے مسئلہ پر غور کرنا پڑے گا۔

جو شخص کسی ملک یا قوم میں پھوٹ ڈالتا ہے وہ بڑا ظالم ہے اور اگر بدقسمتی سے وہ ذہین اور تیز فہم بھی ہے تو ملک و قوم کے لیے سب سے زیادہ خطرناک ہے۔ زبان کی پھوٹ سب سے بڑی پھوٹ ہے، اور اس لیے سب سے بڑا ظلم ہے۔ یہ وہ قہر ہے جو خدا کی طرف سے اہلِ بابل پر نازل ہوا تھا اور آج ہندستان پر نازل کیا گیا ہے۔

دوستو! زبان اپنے بولنے والوں سے اس طرح وابستہ ہی کہ وہ کسی وقت اور کسی حال میں اُن سے جدا نہیں ہو سکتی۔ اٹھتے، بیٹھتے، سوتے جاگتے، ہر وقت ان کی ہمدم ہی۔ ان کی تہذیب اور تعلیم و تربیت کا یہی ذریعہ ہی۔ زبان کا حشر وہی ہوگا جو اس کے بولنے والوں کا ہوگا۔ اس کا بنانا اور بگاڑنا ہمارے ہاتھ میں ہی۔ گزشتہ زمانے میں جیسا ہم نے اُسے بنانا چاہا ویسی ہی بنی اور آیندہ بھی جیسا اُسے بنانا چاہیں گے ویسی ہی بنے گی۔ اس کے بگڑنے میں ہمارا بگڑنا اور اس کے بننے میں ہمارا بننا ہی۔ اس لیے آپ سب سے پہلے اس کی خبر لیجیے اور اسے مخالفوں کی زد سے بچائیے اور سچّے دل سے عہد کیجیے کہ اس پر آنچ نہ آنے دیں گے۔ ہماری زبان کے خلاف خفیہ اور علانیہ، دانستہ یا نادانستہ جو ریشہ دوانیاں اور منظم سازشیں ہو رہی ہیں اس کا علم شاید آپ کو ہو یا نہ ہو لیکن بدنصیبی سے میں کچھ کچھ جانتا ہوں۔ اس لیے میں آپ کو آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ نے اپنی زبان کی حفاظت اور ترقی میں اُسی مستعدی اور سرگرمی، اُسی جوش اور ہمّت، اور اسی خلوص اور ایثار سے کام نہ کیا جو آپ کے حریف کر رہے ہیں تو یاد رکھیے کہ ہمارے ملک کی قسمت میں ذلّت و غلامی کا ایک ایسا طوق رکھا ہی جس کے بوجھ سے ہماری گردنوں کے منکے ٹوٹ جائیں گے اور ہمارے دل و دماغ پاش پاش ہو جائیں گے۔

پھر نہ کہنا کہ کوئی کہتا تھا

خطبۂ صدارت

شعبۂ اُردو۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ

۱۴ار فروری ۱۹۴۱ء

ای صاحبو! اُردو کی داستان جس قدر شان دار ہی اسی قدر دردناک بھی ہی ۔ یہ مقام جہاں آپ جلوہ فرما ہیں اُردو کا گہوارہ اور اُتارا رہا ہی ۔ اسی ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ جگھٹوں میں ہماری زبان کے نام ور ادیب، مورخ، مصنّف، شاعر تکلیف فرماتے اور اپنے کلام سے اہل کانفرنس کو محظوظ کرتے تھے۔ لوگ دُور دُور سے کھچے چلے آتے تھے۔ اور بڑے شوق سے ان جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ قطع نظر دوسرے فوائد کے ان بزرگوں کو دیکھنا ان کی باتیں سننا یا ان سے ملنا ہی اپنی بڑی خوش قسمتی اور اپنی زندگی کا بڑا کارنامہ سمجھتے تھے اور ان باتوں کا تذکرہ آج بھی ہم اپنی صحبتوں میں بڑے فخر سے کرتے ہیں، حالی، شبلی، نذیر احمد کے جوہر یہیں کھلے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اُردو کی بنیادیں مستحکم کیں۔ سید احمد خاں ان سب کے سردار تھے۔

سید کے احسانات سے کون انکار کرسکتا ہے یہ گوناگوں ہیں۔ لیکن ان کا
سب سے بڑا احسان اُردو زبان پر ہے۔ اس نے زبان کو پستی سے
نکالا، اندازِ بیان میں سادگی کے ساتھ قوت پیدا کی، سنجیدہ مضامین
لکھنے کا ڈول ڈالا، سائنٹیفک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی، جدید علوم و
فنون کے ترجمے انگریزی سے کرائے، خود کتابیں لکھیں اور دوسروں
سے لکھوائیں، اخبار سائنٹیفک سوسائٹی (علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ)
جاری کرکے اپنے اندازِ تحریر، بے لاگ تنقید اور روشن خیالی سے
اخبار نویسی کا پایہ بڑھایا، تہذیب الاخلاق کے ذریعے اُردو ادب
میں انقلاب پیدا کیا، ٹائپ کو رواج دیا۔ ان بزرگوں کی سعی عمل سے
علی گڑھ اُردو ادب اور روشن خیالی کا ایسا مرکز ہو گیا تھا جس کی
فضیلت اور برتری سب نے تسلیم کی ہے۔ یہ اُردو زبان کے فروغ
اور اوج کا زمانہ تھا۔ اور اُردو ادب کی تاریخ میں اس کا ذکر ہمیشہ
احترام سے کیا جائے گا۔

کیا اب بھی علی گڑھ کو یہ فضیلت حاصل ہے؟ کالج یونی ورسٹی
ہو گیا ہے۔ عمارتوں کا سلسلہ لا متناہی ہوتا جارہا ہے، علوم و فنون کے
شعبے بڑھتے چلے جارہے ہیں، طلبا کی تعداد کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہے،
لائق پروفیسروں کا ایک خاصا گروہ موجود ہے۔ ظاہری شان و شوکت
بھی کچھ کم نہیں بلکہ پہلے سے بہت زیادہ ہے۔ یہ سب کچھ ہے لیکن روح
نہیں۔ ظاہر شاندار اور روشن ہے لیکن باطن دھندلا ہے۔ پہلے یہ
اُردو ادب کا آستانہ تھا اور اب یہ اس کا مزار ہے۔

اس میں مطلق شبہہ نہیں کہ ماحول کا انسان کے مقصد میں بہت

بڑا دخل ہے۔ ایک ناسازگار ماحول بعض اوقات اعلا سے اعلا دماغی صفات کو زائل کر دیتا ہے۔ اور اگر کوئی معقول صحبت یا ماحول مل گیا اور صلاحیت بھی ہوئی تو آدمی ترقی کے اوج تک پہنچ جاتا ہے۔ سید کے زمانے میں کالج میں ادبیت کا رنگ نظر آتا تھا۔ اول تو وہ خود ایک اعلیٰ نمونہ تھے۔ دوسرے بعض اہلِ کمال اور ادیب کالج میں آتے اور قیام فرماتے۔ طلبا ان کی صحبت سے فیض حاصل کرتے۔ اس کے علاوہ بعض پروفیسر مثلاً پروفیسر آرنلڈ، مولانا شبلی، مولوی کرامت حسین اس پایے کے تھے کہ ان کی تعلیم، گفتگو اور صحبت صحیح علمی اور ادبی ذوق ملکی ضامن تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ سب ادیب اور عالم نہیں ہو سکتے لیکن جن میں کچھ صلاحیت اور مادہ تھا، اس سے مستفید ہوئے اور کچھ کیا بھی۔ حالانکہ اس زمانے میں کالج کے نصاب تعلیم میں اُردو داخل نہ تھی، اب یونی ورسٹی میں اس کا الگ شعبہ ہے اور اس کے پروفیسر اور لکچرار بھی ہیں، مگر وہ ذوق شوق نہیں۔ شاگردوں میں نہ استادوں میں۔

ذہنی قابلیت کے لیے تعلیم، باقاعدہ مطالعہ، مدارس کے معلّم، یونی ورسٹی کے پروفیسر، کتب خانے، تجربے خانے، کتابیں، رسالے، اخبار، اپنے زمانے کے مروّجہ خیالات مکتفی ہوتے ہیں۔ اگر معلم اور پروفیسر نہ بھی ہوں تو صرف کتابیں اس غرض کے لیے کافی ہوتی ہیں۔ لیکن اخلاق اور ذوقی صلاحیت اس طرح حاصل نہیں ہوتی۔ کوئی شخص لکچروں سے نیک و بد اور حسن و قبح میں تمیز پیدا نہیں کر سکتا۔ ایک احساس ہے اور دوسرا جاننا۔ یہ دماغ کی دو مختلف کیفیتیں ہیں۔ ضابطے کی تعلیم جو عموماً امتحان پاس کرانے کی ہوتی ہے صرف ذہن تک

پہنچتی ہے اخلاق اور ذوق کا احساس اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب وہ ہمارے ماحول میں بسا ہوا ہو اور ہمارے روز مرہ کی زندگی کا جز بن گیا ہو۔

محض ذہنی قابلیت بے کار ہے۔ اس کے سوا کچھ اور بھی درکار ہے۔ اس کی تکمیل اخلاقی احساس، عزم، قوت فیصلہ اور تخیل سے ہوتی ہے۔ جو لوگ علم پر قدرت حاصل کرنا چاہتے ہیں انھیں بڑی کڑی تیاری اور سخت جفاکشی کی ضرورت ہے۔ یہ زاہد کا سا زہد اور صوفی کی سی توجہ چاہتی ہے۔ اصل مقصد تک پہنچنے کے لیے اخلاقی قوت لازم ہے اسی قوت سے فرض شناسی اور ذمے داری عطا ہوتی ہے۔ جو ہمارے اُردو زبان کے متعلم اور معلم دونوں میں تقریباً مفقود ہیں۔

یہ کچھ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ ہی کا حال نہیں۔ اس صوبے میں ایک چھوڑ پانچ یونی ورسٹیاں ہیں اور ہر جگہ اُردو کی حالت نہایت پست اور ادنا ہے اور بعض جگہ تو ناگفتہ بہ ہے۔ اس کی حالت ایک ایسے یتیم کی سی ہے جس کا کوئی پرسان حال نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری یونی ورسٹیوں نے اپنی زبان کی وسیع اور زبردست اہمیت کو جو اسے ہندستان کے قومی مسائل میں حاصل ہے پوری طرح نہیں سمجھا۔ علی گڑھ موردِ الزام اس لیے ہو کہ یہ کچھ دنوں پہلے مرجع اہلِ زبان رہ چکا ہے۔ اس کا فرض تھا کہ وہ سنّتِ سید کو قائم رکھتا اور اسے پستی سے بچاتا۔ یہی نہیں بلکہ اسے اور ترقی دیتا۔ اور یہ مقام اُردو کا سب سے بڑا مرکز ہوتا۔ کیا افسوس کا مقام نہیں کہ یونی ورسٹی بننے پر اُردو کی حیثیت اور بھی کم ہو گئی۔

یونی ورسٹی بننے کے بعد پہلا کام یہ ہونا چاہیے تھا کہ اُردو

ذریعہ تعلیم قرار دی جاتی - یہ میں اس لیے کہتا ہوں کہ سرسید پہلے شخص تھے جنھوں نے اُردو یونی ورسٹی کی تجویز پیش کی - میں نے وہ عرض داشت دیکھی ہے جو انھوں نے ۱۸۶۷ء میں حکومت ہند کو بھیجی تھی - یہ اس قدر معقول مدلل واضح اور روشن ہے کہ اس کے بعد سے اب تک جتنی تحریریں اس موضوع پر لکھی گئی ہیں ان میں کوئی بات ایسی نہیں جو اس عرض داشت میں نہ ہو - اسے پڑھ کر مجھے ان کی دوربینی عالی دماغی اور اصابت رائے پر حیرت ہوئی - ذریعہ تعلیم کا مسئلہ ایسا نہیں جو زیادہ مدت تک ٹالا جاسکے - دانش مندی کا تقاضا یہ ہے کہ انتظار کرنے اور مجبور ہو جانے سے پہلے کام شروع کر دیں - اندور میں یونی ورسٹی کی تجویز ہو چکی ہے - راجپوتانے کے لیے جے پور میں بھی یہ مسئلہ در پیش ہے - یہ دونوں لازماً ہندی کی ہوں گی - مہاراشٹر میں بھی علاحدہ یونی ورسٹی قائم کرنے کے لیے حکومت بمبئی نے ایک کمیٹی مقرر کی ہے جو تمام امور متعلقہ کی تحقیق کر رہی ہے اور ملک کے ممتاز لوگوں کی رائیں طلب کر رہی ہے اس میں ایک مسئلہ ذریعۂ تعلیم کا بھی ہے - اس وقت یہ کہنا مشکل ہے کہ آخری فیصلہ کیا ہوگا لیکن زیادہ میلان مرہٹی کی طرف ہے - ہندو یونی ورسٹی بنارس میں بھی یہ طے ہو چکا ہے کہ اس کا ذریعہ تعلیم ہندی ہوگا - لکھنؤ یونی ورسٹی میں بھی یہ قرارداد منظور ہو چکی ہے - ہماری یونی ورسٹی جو اسلامی علم و تہذیب کا مرکز ہے ابھی تک تذبذب میں ہے - کچھ سوچ رہی ہے - سوچنا اور غور کرنا بے شک ایک مبارک فعل ہے اور اہلِ دانش کا شیوہ ہے لیکن سوچتے ہی رہ جانا اور عمل کی طرف قدم نہ اٹھانا کاہلوں اور شیخ چلیوں کا کام ہے - شیخ چلی کوئی بُرا آدمی نہ تھا -

اس میں تخیل بھی تھا اور سوجھ بوجھ بھی۔ اس کے منصوبوں میں کہیں منطقی ضعف نہیں پایا جاتا۔ صرف ایک کسر تھی کہ بے عمل تھا۔ اسی لیے ناکام رہا اور بدنام ہوا۔

اگر کسی یونی ورسٹی کو حق تھا کہ وہ ذریعۂ تعلیم اُردو قرار دیتی تو وہ علی گڑھ یونی ورسٹی تھی ایک تو اس لیے کہ اس کے پاس سرسیّد کی دستاویز موجود تھی، اس کے بعد کسی اور تصدیق کی احتیاج نہ تھی۔ دوسرے ایک اچھی مثال علی گڑھ کے پڑوس دلی میں موجود تھی جہاں اب سے ایک صدی پہلے دہلی کالج میں جدید علوم اور سائنس کی تعلیم اُردو کے ذریعے سے دی جاتی تھی اور اس وقت کے ماہران تعلیم نے اعتراف کیا ہے کہ وہاں کے طلبا جو اُردو میں سائنس پڑھتے ہیں، لیاقت میں کسی طرح کلکتہ یونی ورسٹی کے ان طلبا سے کم نہیں جن کو سائنس کی تعلیم انگریزی میں دی جاتی ہے۔ ان دونوں سے قطع نظر کیجیے، پرانی باتیں ہیں۔ ہماری خوش قسمتی سے حیدرآباد میں جامعۂ عثمانیہ کی زندہ مثال موجود ہے۔ جہاں تمام قدیم و جدید علوم و فنون اُردو میں پڑھائے جاتے ہیں۔ اس کے بعد بھی وہی فرسودہ اور پوچ عذرات پیش کرنا جو اس سے پہلے بارہا پیش کیے جاچکے اور رد ہوچکے ہیں، منطق سے بھی اور عمل سے بھی، اپنی کوتاہی اور نارسائی کا اشتہار اور اپنی بزدلی کا اظہار ہے۔ بات یہ ہے کہ انگریز سے زیادہ انگریزی ہمارے دل و دماغ پر مسلط ہے اور ہمارے جسم اور دماغ کے ایک ایک ذرّے میں رچی ہوئی ہے۔ اس لیے دلیل و منطق، مثال و مشاہدہ سب بے کار ہیں۔ یہ نہیں کہ نہ سمجھتے ہوں، خوب سمجھتے ہیں لیکن دل کے ہاتھوں لاچار ہیں۔

خیر، یہ جب ہوگا تب ہوگا۔ اس وقت یونی ورسٹی کے شعبہ اُردو کی طرف فوری توجہ کی ضرورت ہے۔ یونی ورسٹی کے کارفرماؤں کا فرض ہے کہ وہ اپنے اُردو شعبے کو ایسا مستعد، کارآمد اور اعلادرجے کا بنائیں کہ دوسری یونی ورسٹیوں کے لیے مثال ہو۔ تعلیم و تحقیق کا بہترین سامان مہیا کیا جائے۔ کتب خانہ بہت معقول ہو۔ لیکن ان سب سے بڑھ کر پروفیسر اور لکچرار ایسے ہوں جنھیں ادب سے سچا لگاؤ ہو، صحیح ذوق رکھتے ہوں۔ اُردو زبان، اس کے قدیم و جدید ادب اور اس کی تاریخ کے عالم اور اس کی بڑھتی ہوئی اہمیت اور ضرورتوں سے واقف ہوں، اپنے کام سے محبت اور اُردو زبان کی خدمت کی لگن ہو، جس سے ان کے شاگردوں کے دلوں میں امنگ اور جوش پیدا ہو۔ شبلی، آرنلڈ، حالی، سرسید، کرامت حسین کچھ اٹھا کے نہیں دے دیتے تھے یا کچھ گھول کر نہیں پلا دیتے تھے۔ ان کی زندگی، ان کے انہماک اور ان کی صداقت کا اثر نا معلوم طور پر خود بہ خود نوجوانوں کی زندگی پر پڑتا تھا۔ یونی ورسٹیاں قواعد و ضوابط، کونسلوں اور کورٹوں، کیلنڈروں اور امتحانوں سے نہیں بنتیں یہ ضمنی اور ذیلی چیزیں ہیں۔ یونی ورسٹیاں پروفیسروں سے بنتی ہیں۔ ایک کامل الفن کو لاکر بٹھا دیجیے اور پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ طالب علم پروانوں کی طرح اس کے گرد جمع ہو جائیں گے۔ لیکن مرد کامل کو پہچانے کون؟ جہاں اہل علم کا انتخاب ہاتھ اٹھانے اور ووٹوں پر ہو اور پروپیگنڈا اور "کان وسنگ" اس پر مزید تو وہاں کسی کامل فن کے انتخاب کی توقع عبث ہے۔ مرد کامل درخواست

نہیں دیتا، وہ سفارشوں کے لیے دردر نہیں مارا پھرتا۔ اس سے ہمیں درخواست کرنی چاہیے۔ اسے ہمارے پاس آنے کی ضرورت نہیں۔ اس کے پاس ہمیں جانا چاہیے۔ اس کی صحبت میں بیٹھ کر وہ چیز حاصل ہوتی ہے جو پی۔ ایچ۔ ڈی صاحب کو برسوں یورپ میں پھرنے سے میسّر نہیں آسکتی۔ کس قدر افسوس اور شرم کی بات ہے کہ ہمارے طالب علم، اور طالب علم ہی کیا اُستاد اور پروفیسر بھی اُردو کی ڈگری لینے لندن جاتے ہیں اور بیلی صاحب کی عطا کی ہوئی ڈگری فخر سے اپنے نام کے ساتھ لکھتے ہیں اور بوالعجبی دیکھیے کہ ہماری یونی ورسٹیاں بھی اس ڈگری کو تسلیم کرتی ہیں۔ کیا ہم اپنی یونی ورسٹیوں میں اُردو تعلیم کا انتظام نہیں کرسکتے؟ کیا یہ نہیں ہونا چاہیے تھا کہ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ، جامعہ عثمانیہ، اورنٹیل کالج پنجاب یونی ورسٹی لاہور میں اُردو کی تعلیم کا ایسا بہتر انتظام ہوتا کہ یورپ والے ہماری ان یونی ورسٹیوں میں آتے اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں لے کر جاتے؟

شعبۂ اُردو کو بہتر اور اعلا بنانے میں بہت سی مصلحتیں ہیں۔ اس زمانے میں زبان کا مسئلہ بہت اہم ہوگیا ہے۔ اب جو کچھ ہو رہا ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔ آیندہ اس سے زیادہ مشکلات آنے والی ہیں۔ اس لیے ہمیں ایسے طالب علموں کی ضرورت ہے جن کے دلوں میں اپنی زبان کی وقعت اور اہمیت پورے طور پر جاگزیں ہو۔ انسان بالطبع کاہل اور آسانی پسند واقع ہوا ہے اور خاص کر آج کل کے طالب علموں میں مطالعہ اور دل لگا کر کام کرنے کی طرف سے بے اعتنائی

بڑھتی جا رہی ہے۔ انھیں محنت اور جفاکشی کا عادی بنانا چاہیے۔ پیہم اور مسلسل محنت کرنے سے ہی مقصد حاصل ہوتا ہے۔ بے اعتنائی اور بے عملی زندگی کے ہر شعبے میں مصیبتوں کا پیش خیمہ ہو جاتی ہے۔ ان کی تربیت ایسی ہونی چاہیے کہ وہ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد بھی ذوقِ ادب ساتھ لیتے جائیں اور اسے اپنی زندگی کا جز بنالیں اور کسی حال میں ہوں اپنے غور و فکر اور کام سے ادب میں اضافہ کرنے اور اپنی زبان کی ترقی و اشاعت میں کوشاں رہیں۔

اس کے علاوہ زبان کے مطالعے اور تعلیم میں اس امر کا خاص طور پر لحاظ رکھا جائے کہ ہمارے طلبا زبان کی اصلی ماہیت اور اس کی فطرت سے بہ خوبی واقف ہوں اور اپنے مافی الضمیر کے اظہار میں صحت اور صفائی میں کافی قدرت رکھتے ہوں۔ جس طرح اشیا اور ادویہ اور انسانوں کا مزاج ہوتا ہے اسی طرح زبان کا بھی ایک مزاج ہوتا ہے جو اس کی فطرت ہے۔ خلاف مزاج دوا ہو یا بات ہمیشہ ناگوار یا مضر پڑتی ہے اسی طرح اگر کوئی ایسی بات کہی یا لکھی جائے جو زبان کے مزاج یا اس کی فطرت کے خلاف ہو تو وہ بھی ناگوار ہوتی ہے اور اس کا کہنے یا لکھنے والا تعلیم یافتہ اور شایستہ نہیں سمجھا جاتا۔ آج کل ہمارے اکثر تعلیم یافتہ انگریزی کے ذریعے سے اپنی زبان سمجھتے ہیں اور اردو میں اپنے خیالات انگریزی کی وساطت سے ظاہر کرتے ہیں۔ ان حضرات کی تحریریں اور خصوصاً ترجمے دیکھ کر غور کرنا پڑتا ہے کہ یہ کہتے کیا ہیں ان کے دماغ میں انگریزی ترکیبیں، جملے کی انگریزی ساخت اور انگریزی محاورے سمائے ہوئے ہیں۔ جب وہ انھیں

اپنی زبان میں منتقل کرتے ہیں تو وہ ایک عجیب و غریب زبان ہو جاتی ہے جسے اُردو داں مشکل سے سمجھ سکتا ہے اور بعض اوقات تو خود مترجم یا مولف بھی سمجھنے سے قاصر رہتا ہے۔ علمی ترجموں کی تو بری طرح مٹی پلید ہوتی ہے۔ ایک طرف تو وہ انگریزی کا صحیح مفہوم نہیں سمجھتے اور دوسری طرف وہ یہ نہیں جانتے کہ اُردو میں خیال کس ڈھنگ سے ادا کیا جائے کہ وہ ہماری زبان کے روزمرہ اور محاورے کے مطابق ہو اور زبان کی فطری ساخت کے مخالف نہ پڑے۔ انگریزی زبان کا علم ناقص، اپنی زبان پر عبور نہیں، اب جو کچھ تحریر میں آئے گا وہ کیسا ہوگا۔ اس کا اندازہ آپ بھی بخوبی کر سکتے ہیں۔ میں اس کی بے شمار مثالیں پیش کر سکتا ہوں لیکن آپ کا وقت ضایع کرنا نہیں چاہتا۔ جسے شبہہ وہ دارالترجمہ عثمانیہ کے بعض علمی کتابوں کے ترجمے دیکھ لے اور ان کا مقابلہ ان ترجموں سے کرے جو سو سال پہلے دہلی کالج میں ہوئے تھے۔

سنہ ۱۸۷۱ء کا واقعہ ہے مسٹر ایچ۔ بی۔ بوئرونی انڈر سکریٹری فارن آفس نے ہیئت کی ایک انگریزی کتاب کے اُردو ترجمے کے لیے اشتہار دیا اور ایک ہزار رُپیہ انعام مقرر کیا۔ مولوی نذیر احمد نے بھی اس کا ترجمہ کیا اور وہ انعام انھیں کو ملا۔ میں نے وہ ترجمہ دیکھا ہے پڑھتے چلے جائیے کہیں الجھن نہیں معلوم ہوتی۔ الفاظ اور اصطلاحات ایسی برجستہ اور برمحل ہیں کہ ترجمے کا گمان تک نہیں ہوتا۔ اصل تصنیف معلوم ہوتی ہے۔ اُردو تعزیرات ہند ہی کو دیکھ لیجیے ہے تو ترجمہ مگر تصنیف کی شان نظر آتی ہے۔ اس کی اصطلاحات ہماری زبان کا

جذب ہوگئی ہیں۔ مولوی نذیر احمد انگریزی کے عالم نہ تھے نہ ان کے پاس یونی ورسٹی کی سند تھی۔ بات کیا تھی وہ مفہوم کو سمجھ کر اس طرح اپنی زبان کے محاورے میں ادا کرتے کہ اصل کی روح کھینچ کر رکھ دیتے تھے۔ مولوی کرامت حسین فلسفہ اور سائنس کے مضامین کس خوبی سے لکھ گئے ہیں۔ بہت سی اصطلاحات جو اب ہماری زبان میں عام ہوگئی ہیں۔ پہلے پہل انھیں کی بدولت ہم تک پہنچیں۔ اب جو ترجمے ہوتے ہیں وہ صحیح بھی ہوں تو روح مفقود ہوتی ہے۔ یہی علمی تالیفات کا حال ہے۔ یہ لسانی تعلیم کی خامی اور اپنی بے مائگی ہے۔ ہماری یونی ورسٹیوں میں اپنی زبان کا مطالعہ سرسری اور اوپری ہوتا ہے۔ اس نظر سے کیا ہی نہیں جاتا کہ اس کی تہ تک پہنچیں اور اس پر قدرت حاصل کریں ورنہ ہماری زبان ایسی کم مایہ نہیں جیسی خیال کی جاتی ہے۔ اس بے تہی اور خامی کو رفع کرنا اُردو شعبوں کا کام ہے

یہ شکایت صرف یونی ورسٹی سے نہیں۔ اس صوبے کی حالت بھی اُردو زبان کے معاملے میں روز بہ روز پست ہوتی چلی جاتی ہے (دلّی اگرچہ انتظامی اور سیاسی تقسیم کی بنا پر الگ ہے لیکن ادبی اعتبار سے اس کا شمار اسی صوبے میں ہے) یو۔ پی والوں کا یہ فخر بجا ہے کہ اُردو کو ترقّی اور عروج یہیں حاصل ہوا۔ یہیں کی زبان فصیح اور ٹکسالی مانی گئی اور ملک کے ہر علاقے میں رائج ہوئی۔ یہاں ایسے نام ور اور ممتاز ادیب، شاعر اور مصنّف ہوئے جن کے نام جب تک اُردو زبان قائم ہے زندہ رہیں گے۔ لیکن جب ہم صوبے کے موجودہ حالات پر نظر کرتے ہیں تو یہ سب فخر و امتیاز بے جا اور بے محل

معلوم ہوتا ہو۔ یہی نہیں کہ ادبی تخلیق کے سوتے بند ہو گئے ہیں بلکہ زبان کی ترقی و اشاعت کے لوازم اور سامان بھی مفقود ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اب سے بیس پچیس سال پہلے تک صوبۂ متحدہ اُردو کتابوں کی طباعت و اشاعت کا مرکز تھا۔ لکھنؤ، کان پور، الہ آباد، علی گڑھ، آگرے میں بیسیوں اُردو کے اچھے چھاپے خانے تھے۔ کان پور کے رحمت اللہ رعدؔ مرحوم کے نامی پریس کی چھپی ہوئی کتابیں مثلاً مثنوی مولانا روم، دیوان حافظ وغیرہ حُسنِ طباعت اور نفاست کا اعلا نمونہ تھیں۔ رعدؔ مرحوم اپنے فن کے ماہر ہی نہ تھے انھیں اپنے فن سے عشق تھا۔ آگرے کا ابوالعلائی اسٹیم پریس سنگی طباعت کے لیے صوبے بھر میں مشہور تھا۔ لکھنؤ میں ایک دو نہیں متعدد چھاپے خانے تھے جن کی چھپی ہوئی کتابیں خوبیٔ طباعت کی وجہ سے بہت پسند کی جاتی تھیں۔ الہ آباد کے بعض چھاپے خانوں کا بھی کم و بیش یہی حال تھا۔ آخر میں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی پریس نے کتابت و طباعت کی حسن و خوبی کی وجہ سے بہت نام پایا اور بہت اچھی اچھی کتابیں چھاپیں۔ افسوس ہو کہ چند ہی سال میں یہ مطبعے گم نام و بے نشان ہو گئے اور آج یہ روایتیں داستانِ پارینہ معلوم ہوتی ہیں۔ اب یہ حال ہو کہ اس صوبے کی چھپی ہوئی اُردو کتابیں طباعت و کتابت کے بھدّے پن کے لیے مشہور ہیں۔ ایک نول کشور پریس ضرور باقی ہو لیکن اب اِسے فارسی اُردو سے وہ شیفتگی نہیں رہی۔ رہا علی گڑھ جسے صحیح معنوں میں علم و تہذیب کا مرکز قرار دیا جاسکتا ہو وہ اُردو سے بے نیاز ہو چکا ہو۔ یہاں اُردو کی دو ایک کتابیں چھپ جاتی ہیں تو اِن کا

چھپنا نہ چھپنا برابر ہے۔ ظاہر ہے کہ جب اس صوبے میں اُردو طباعت کے مرکز ہی نہ رہے تو زبان کی اشاعت میں بڑی رکاوٹ پیدا ہو گئی۔

اگرچہ اس صوبے کی دفتری اور عدالتی زبان اُردو کہی جاتی ہے لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ حکومت کے تمام محکمے جن کا تعلق زبان کی ترقی و اشاعت سے ہے، قریب قریب سب کا رویہ اُردو کے ساتھ غیر منصفانہ اور ایک حد تک معاندانہ ہے۔ محکمۂ تعلیم، محکمۂ توسیع تعلیم، محکمۂ دیہات سدھار اور اسی قبیل کے دوسرے محکمے اس روش میں متحد ہیں لیکن جہاں حکومت قابلِ الزام ہے وہاں ہماری اپنی کوتاہی کو بھی بڑا دخل ہے۔ سوال یہ ہے کہ آیا کبھی ہم نے موثر طور پر حکومت کی ان زیادتیوں کے خلاف آواز اٹھائی۔ ہم نے کبھی بھول کر بھی یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ محکمۂ توسیع تعلیم اور محکمۂ دیہات سدھار میں ہر سال کتنی کتابیں اور کس قسم کی خریدی جاتی ہیں۔ ان میں اُردو کی کتنی ہوتی ہیں اور ہندی کی کتنی۔ کیا کبھی ہم نے یہ جاننے کی زحمت گوارا کی کہ حکومت کے مدارس اور وہ تعلیم گاہیں اور ادارے جو حکومت سے امداد پاتے ہیں اُردو کی کتنی کتابیں خریدتے ہیں اور اگر اُردو کتابوں کی خریداری کا تناسب ہندی کتابوں کی خریداری سے کم ہے تو کیوں؟

گزشتہ سال میں نے انہی امور پر غور کرنے کے لیے ایک مختصر کمیٹی لکھنؤ میں منعقد کی تھی جس میں صوبے کے اہلِ مطابع اور ناشروں نیز بعض ایسے اصحاب کو مدعو کیا تھا جو کتابوں کی اشاعت و تالیف کا تجربہ رکھتے ہیں۔ یہ ایک مختصر مشاورتی مجلس تھی۔ کافی بحث و گفتگو

کے بعد چند تجویزیں منظور ہوئیں۔ انجمن ترقیٔ اُردو ہند انھیں عمل
لانے کے لیے غور کر رہی ہے اور اس بارے میں بعض صحیح معلومات
حاصل کرنے کے لیے خط و کتابت کی جا رہی ہے۔

یو۔پی کی زبوں حالت کا صحیح اندازہ اُردو مطبوعات روز افزوں
کمی سے ہوتا ہے۔ میں یہاں چند سال کے اعداد پیش کرتا ہوں

	کل ہند		یو۔پی	
	ہندی	اُردو	ہندی	اُردو
سنہ ۱۹۳۱ء	۶۳۱۹	۱۱۷۷	۱۷۵۹	۳۸۷
سنہ ۱۹۳۲ء	۲۸۲۳	۱۳۹۰	۲۰۹۰	۴۰۱
سنہ ۱۹۳۳ء	۲۹۶۹	۵۴۳	۲۲۳۲	۳۷۵
سنہ ۱۹۳۵ء	۲۸۸۶	[illegible]۳	۲۰۹۶	۳۰۶
سنہ ۱۹۳۶ء	۲۹۴۱	۱۰۱	۲۰۹۸	۲۵۴
سنہ ۱۹۳۸ء			۱۷۸۵	۱۸۳
سنہ ۱۹۴۰ء		(نو مہینے میں)	۱۰۷۷	۱۵۹
سنہ ۱۹۴۱ء	۲۱۱۳	۱۳۲۰	۱۲۹۰	۱۹۸

یہ اعداد بہت ہمت شکن اور مایوس کن ہیں۔ انھی اعداد کو
دیکھ کر بعض زمانہ شناس صاحبوں نے یہ رائے قائم کی ہے کہ اُردو
اس صوبے میں چند سال کی مہمان ہے۔ ایک مدت پہلے معاملہ اس کے
برعکس تھا اور ہندی اُردو کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ مجھے اتنا وقت
نہیں ملا کہ سنہ وار مسلسل اعداد جمع کرتا، جلدی میں جو چند اعداد
دست یاب ہوئے وہ پیش کر رہا ہوں۔ جس سے آپ کو اس کا اندازہ

ہو جائے گا۔

۱۸۵۱ء میں ہندی اُردو کی کل کتابیں ۱۲۶ شایع ہوئیں جن میں سے ۱۴ اُردو کی تھیں۔ ۱۸۶۱ء میں صوبہ شمالی مغربی میں (۱۷) اخبار تھے ان میں (۱۱) اُردو کے تھے اور ۶ ہندی کے۔ ۱۸۶۸ء میں میٹریکولیشن کے امتحان میں ۲۵۲ طلبا اُردو کے تھے اور ۲۸ ہندی کے۔ ڈائرکٹر تعلیمات صوبہ شمالی مغربی کی رپوٹ ۱۸۶۹ء سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۶۸ء میں کل کتابیں ۲۵۳ شایع ہوئیں جن میں (۱۴۶) اُردو کی تھیں اور ۸۰ ہندی کی۔ ہندی اُردو کے کل اخبار ۲۴ تھے۔ اُردو کے (۱۶) اور ہندی کے پانچ۔ ۱۸۶۹ء میں ۳۱ اخباروں میں سے (۲۶) اُردو کے تھے اور پانچ ہندی۔ اُردو اخباروں کے کئی اڈیٹر ہندو تھے۔

۱۸۷۴ء میں آگرہ و اودھ سے (۲۵) اُردو کے اور صرف ۹ ہندی کے اخبار نکلتے تھے۔ ۱۸۷۵ء میں ۲۰ نئے اخبار شایع ہوئے جن میں (۱۸) اُردو کے تھے اور دو ہندی کے۔ ڈائرکٹر تعلیمات صوبہ پنجاب کی رپوٹ ۱۸۶۷ء، ۱۸۶۸ء سے معلوم ہوتا ہے کہ کل ۱۵۲ کتابیں شایع ہوئیں ان میں (۱۱) اُردو کی تھیں اور ۴۳ ہندی کی، ناظم تعلیمات صوبہ شمالی مغربی کی رپوٹ ۱۸۶۹ء سے ظاہر ہوتا ہے کہ کل ۲۵۳ کتابیں شایع ہوئیں، ان میں (۱۴۶) اُردو کی اور ۱۰۷ ہندی کی تھیں۔ ۱۸۷۶ء میں اُردو ہندی کے ۵۲ نئے اخبار اور رسالے نکلے ان میں (۴۴) اُردو کے تھے اور ۸ ہندی کے۔ ۸ رمئی ۱۸۷۲ء کے گورنمنٹ گزٹ میں نامی کتابوں کی فہرست شایع

ہوئی ہے، یہ کتابیں گورمنٹ کے اعلان کے مطابق انعام کے لیے ہندی اُردو دونوں زبانوں میں لکھی گئی تھیں۔ ان کتابوں کی تعداد ۲۳ تھی۔ ان ۲۳ میں ۴ کتابیں ہندی کی تھیں اور باقی (۱۹) اُردو کی۔ ہندی کتابوں پر ادنیٰ انعام پچاس پچاس رُپیہ کا دیا گیا۔ اُردو کتابوں پر چار ہزار ایک سو پچاس رُپیہ انعام دیا گیا۔ اُردو کتابوں کے مصنفین میں ۷ ہندو ایک انگریز اور ۸ مسلمان تھے۔ ۱۸۷۳ء میں ۲۹ کتابیں انعامی تھیں۔ ان میں ۲۲ اُردو کتابوں پر اور ۷ ہندی کتابوں پر انعام ملا۔ ہندی کتابوں کے لکھنے والے سب ہندو تھے۔ اور اُردو کتابوں کے مولف ۱۰ ہندو ایک انگریز اور ۱۱ مسلمان تھے۔ ۱۸۷۳ء میں درسی کتابوں کے علاوہ جو کتابیں شایع ہوئیں ان میں (۴۵) اُردو کی تھیں اور ۳۵ ہندی کی۔ ۱۸۷۴ء میں انعامی کتب (۱۶) اُردو اور ۲ ہندی۔ ۱۸۷۴ء میں چیف کمشنر اودھ نے اُردو ہندی کی بحث میں ایک چٹھی شایع کی تھی اس میں لکھا ہے کہ تنہا لکھنو میں اُردو کی ۱۷۲ کتابیں شایع ہوئیں اور ہندی کی صرف ۴۱۔

آپ نے دیکھا، حالت کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے۔ ان واقعات کے سامنے آپ کی زباں دانی شعروشاعری اور ترقی پسندی کے دعوے سب ہیچ ہیں۔ اعداد پکارے بول رہے ہیں کہ اگر آپ نے جلد خبر نہ لی تو حالت اس سے بدتر ہونے والی ہے۔ مانا کہ آپ میں ذہانت ہے، تھوڑی بہت جدّت بھی ہے، تخیل بھی ہے، لیکن یہ سب بے کار ہیں۔ اگر قوّتِ عمل نہیں، بے عملی ذہانت اور جدّت کو فنا کر دیتی ہے۔ افراد ہوں یا قومیں سب اس کا شکار ہو چکے ہیں۔ یہی

صورت اب ہمارے سامنے پیش ہے۔ اس کا علاج بھی ہمارے ہاتھ میں ہے اور وہ یہ ہے کہ سہل انگاری چھوڑ کر مستعدی کے ساتھ آمادۂ عمل ہو جائیں۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور خاص کر صوبے کی کانفرنس کو پوری توجہ کے ساتھ اس پر غور کرنا چاہیے اور غور کرنے کے بعد جو تدبیریں تجویز ہوں ان پر فوراً عمل درآمد کیا جائے۔ یہ سرسری معاملہ نہیں ہے، بہت سنگین ہے ایسے معاملات میں تاخیر اور سہل انگاری موت کے دروازے تک لے جاتی ہے۔ اگر ایجوکیشنل کانفرنس آمادہ ہو تو انجمن ترقیٔ اُردو تعاون کے لیے حاضر ہے

اُردو کو شکست پر شکست کیوں ہوئی۔ اس کی خاصی بڑی تاریخ ہے (جو انجمن مرتب کرا رہی ہے)۔ اس میں شبہہ نہیں کہ اس میں ہماری غفلت کو بھی بہت کچھ دخل ہے، مگر دوسرے اسباب بھی ہیں۔ یہاں میں ان پر سرسری نظر ڈالنا چاہتا ہوں۔

آپ کو معلوم ہے کہ نومبر ۱۸۳۷ء میں حکومت نے ایک بجٹ پاس کیا۔ جس کی رُو سے دفتروں اور عدالتوں کی زبان فارسی سے اُردو کر دی گئی۔ جب تک فارسی رہی کسی نے زبان کی شکایت نہ کی اور جب اُردو ہوئی تو بھی کوئی شکایت پیش نہ ہوئی۔ ہندی اُردو کی نزاع ۱۸۶۷ء سے شروع ہوتی ہے۔ جب بنارس کے بعض معزز ہندوؤں نے تمام سرکاری عدالتوں میں اُردو زبان اور فارسی خط کے موقوف کرنے اور اس کے بجائے ہندی بھاشا رائج کرنے کی کوشش کی۔ مولانا حالی حیات جاوید میں لکھتے ہیں کہ ”سرسید کہتے تھے کہ یہ پہلا موقع تھا جب کہ مجھے یقین ہو گیا کہ اب ہندو مسلمان

کا بہ طور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کے لیے ساتھ ساتھ کوشش کرنا محال ہی"۔ ان کا بیان ہی کہ "ابھی دونوں میں جب کہ یہ چرچا بنارس میں پھیلا، ایک روز مسٹر شیکسپیر سے جو اس وقت بنارس میں کمشنر تھے، میں مسلمانوں کی تعلیم کے باب میں گفتگو کر رہا تھا اور وہ متعجب ہو کر میری گفتگو سن رہے تھے۔ آخر انھوں نے کہا کہ آج یہ پہلا موقع ہی کہ میں نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقّی کا ذکر سنا ہی، اس لیے کہ پہلے تو ہمیشہ تم عام ہندستانیوں کی بھلائی کا خیال ظاہر کرتے تھے۔ میں نے کہا کہ اب مجھ کو یقین ہو گیا ہی کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی۔ ابھی تو بہت کم ہی۔ آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد ان لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں، بڑھتا نظر آتا ہی۔ جو زندہ رہے گا وہ دیکھے گا۔ انھوں نے کہا اگر آپ کی پیشین گوئی صحیح ہو تو نہایت افسوس ہی۔ میں نے کہا مجھے بھی افسوس ہی مگر اپنی پیشین گوئی پر مجھے پورا یقین ہی۔"

اس کی تصدیق سید صاحب کے اس بیان سے بھی ہوتی ہی جو علی گڑھ کی تعلیمی سروے میں پایا جاتا ہی۔ یہ سروے انھوں نے خود کی تھی۔ لکھتے ہیں کہ "تیس برس کے عرصے سے مجھ کو ملک کی ترقّی اور اس کے باشندوں کی فلاح کا خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان، خیال پیدا ہوا ہی اور ہمیشہ میری یہ خواہش تھی کہ دونوں مل کر دونوں کی فلاح میں کوشش کریں۔ مگر جب سے ہندو صاحبوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اُردو زبان اور فارسی کو جو مسلمانوں کی حکومت اور ان کی شاہنشہی ہندستان کی باقی ماندہ نشانی ہی مٹا دیا جائے۔ اس وقت

سے مجھ کو یقین ہو گیا کہ اب ہندو مسلمان باہم متفق ہو کر کام نہیں کر سکتے۔ میں نہایت درستی اور اپنے تجربے اور یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ہندو مسلمانوں میں جو نفاق شروع ہوا ہے اس کی ابتدا اسی سے ہوئی"۔ یہ ہے اصل بنیاد ہندو مسلم تنازع کی۔ سیاسی مذہبی جھگڑے بعد کے ہیں اور اسی سے نکلے ہیں۔ اس وقت سے دلوں میں ایسا بل پڑا ہے کہ اب تک نہیں نکلا بلکہ دن بہ دن اور سخت ہوتا جاتا ہے۔

۱۸۶۸ء اور ۱۸۶۹ء میں اردو ہندی کی بحث میں شدت شروع ہوئی۔ الہ آباد میں ہندی کی حمایت میں ایک صدر مجلس قائم ہوئی اور مختلف مقامات میں اس کی شاخیں بنائی گئیں۔ اس صدر مجلس کے سکریٹری (بابو سرودا پرشاد سنڈیال) اور سر سید میں اسی تنازع کے متعلق مراسلت ہوئی۔ اخبار سائنٹیفک سوسائٹی، بنارس گزٹ، رسالۂ جلسۂ تہذیب لکھنؤ، نورالابصار وغیرہ اخبارات میں دونوں طرف سے بڑے بڑے گرم مضامین نکلے۔

اِدھر یہ بحث ہو رہی تھی کہ بہار میں حکومت بنگال نے زبردستی اردو کی جگہ ہندی رائج کر دی۔ اردو کے حامی کچھ نہ کر سکے۔ میں بہ خوفِ طوالت اس زبردستی کے متعلق اس وقت کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ صرف اخبار "انگلش مین" کلکتے کے ایک مضمون کا اقتباس جو اس نے اسی زمانے میں "ہندی یا اردو" کے عنوان سے تحریر کیا تھا، پیش کرتا ہوں۔

"حکومت نے ارادہ کیا ہے کہ بہار کے دفتروں اور عدالتوں میں سرکاری کام ہندی زبان اور ناگری خط میں ہوا کرے۔ اس بوالعجبی

کی وجہ ہماری سمجھ میں نہیں آئی ۔ کیوں کہ بہار کی رائے عامہ اس تبدیلی کے خلاف ہے ۔ ایک تو یہ کہ صدیوں کے استعمال کی وجہ سے لوگ فارسی رسم الخط کے عادی ہو چکے ہیں ۔ دوسرے عدالتی یا تجارتی امور میں اُردو کا رواج زمانۂ دراز سے ہے ۔ ان اسباب کی بنا پر تبدیلی نامناسب معلوم ہوتی ہے ۔ ہم نے سُنا ہے کہ بہت سے باثر مسلمانوں اور ہندوؤں نے اس تبدیلی کے خلاف حکومت کو لکھا ہے ۔ مسٹر ایڈی بنگال کے نئے لفٹنٹ گورنر حال میں بہار کا دورہ کر کے لوٹے ہیں وہ ازراہِ انصاف کہہ دیں کہ عوام کی زبان کون سی ہے ۔ کیا انھوں نے پڑوس کے صوبہ جات شمال و مغربی کی عدالتوں کی زبان نہیں دیکھی ۔ اس شہادت کے بعد کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں رہتی "۔ الغرض ۱۸۶۷ء جب سر سید کو یہ معلوم ہوا کہ مدرسوں اور دفتروں میں دیوناگری جاری کرنے کے لیے ایک درخواست ہندوں کے دستخطوں کے لیے گشت کرائی جارہی ہے تو انھوں نے ۹ دسمبر ۶۷ء کو الہ آباد میں ایک بڑا جلسہ کیا اور اُردو کی حفاظت کے لیے ایک صدر مجلس الہ آباد میں قائم کی جس کے سر سید سکریٹری قرار پائے اور اس کی شاخیں دوسرے اضلاع میں قائم کی گئیں ۔ سر سید نے ایک پرزور اور مدلّل سرکلر جاری کیا جس میں ان نقصانات کو مفصل طور پر بیان کیا جو اس تبدیلی سے پہنچیں گے ۔ ۱۸۸۲ء میں جب حکومت ہند کے مقرر کردہ مشہور ایجوکیشن کمیشن کا دورہ بہ غرض تحقیقات ملک میں ہوا تو یہ جنون پھر بڑی شدت سے اُچھلا اور اضلاع شمال مغربی اور پنجاب کے ہندوؤں نے اُردو زبان کی بڑی زور شور سے مخالفت کی اور دونوں صوبوں کی بے شمار

سبھاؤں اور انجمنوں کی طرف سے بڑے بڑے طولانی محضر پیش ہوئے۔
چناں چہ ڈاکٹر ہنٹر نے جو اس کمیشن کے صدر تھے۔ ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ کے اڈریس کے جواب کے ضمن میں کہاکہ روزانہ ڈاک میں ہمارے پاس بے شمار دستخطوں کے ساتھ ہندی کی حمایت میں میموریل وصول ہو رہے ہیں صرف ایک درخواست پر جو کل ہی وصول ہوئی تین ہزار دو سو ستاسی اشخاص کے دستخط ثبت ہیں" کمیشن میں بھی یہ معاملہ پہنچایا گیا، لیکن سر سید نے اس بنا پر کہ یہ معاملہ اب تعلیمی نہیں رہا سیاسی ہو گیا ہے اس ناگوار بحث کو کمیشن میں نہ آنے دیا۔
یہ آگ جو اندر ہی اندر سلگ رہی تھی۔ مارچ ۱۸۹۸ء میں یکایک بھڑک اٹھی۔ اشتعال کا باعث سر انیٹنی میکڈانل ہوئے جو اس صوبہ میں لفٹنٹ گورنر ہو کر آئے تھے۔ اس سے پہلے صوبۂ بہار میں کلکٹر تھے۔ وہاں بھی اس آگ پر بہت تیل چھڑکا تھا۔ ان کے آنے سے ہندی کے طرف داروں کے حوصلے بڑھ گئے۔ معزز اور سر برآوردہ ہندوؤں نے پھر ایک میموریل لفٹنٹ گورنر کی خدمت میں پیش کیا۔
مولانا حالی لکھتے ہیں کہ" اگر چہ سر سید پر اس زمانے میں ہجوم رنج والم کے سبب ایسا سکتے کا عالم طاری تھا کہ وہ بالکل نقش دیوار بن گئے تھے مگر اسی حالت میں انھوں نے اس مضمون پر ایک آرٹیکل لکھا جو ۱۵ مارچ کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں سر سید کی وفات سے نو دن پہلے شایع ہوا اور جو کمیٹی مسلمانوں نے الہ آباد میں اُردو کی حمایت کے لیے قائم کی تھی اس کو اس باب میں بذریعہ تحریر کے کچھ مشورے دیے اور لکھا کہ" اگر چہ مجھ سے اب کچھ نہیں ہو سکتا

لیکن جہاں تک ممکن ہو گا۔ میں ہر قسم کی مدد دینے کے لیے موجود ہوں"
اسی سال ہندی والوں کا ایک ڈیپوٹیشن لفٹنٹ گورنر بہادر کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جس کو جواب دیتے ہوئے" ہر آنر نے موجودہ دستور عدالت میں جلد تبادلے کو ناپسند کرکے جس کے افسران گورمنٹ عادی نہیں ہیں قبول کیا کہ سرکاری کاغذات میں ناگری حروف کے مزید استعمال سے فائدہ حاصل ہو سکتا ہے"۔ ڈیپوٹیشن کی یہ بڑی کامیابی تھی کہ لفٹنٹ گورنر نے ان کے مطالبے کو قابلِ قبول سمجھا۔ جلد نہیں تو بہ دیر پوری کامیابی میں کچھ شک و شبہہ نہ رہا۔ چناں چہ گورمنٹ کے ریزولیشن مورخہ ۱۸ر اپریل سنہ۱۹۰۰ء میں ناگری حروف جاری کرنے کا قطعی فیصلہ کر دیا گیا۔ لفٹنٹ گورنر نے تو صرف ناگری حروف کی قید لگائی تھی، لیکن وائسرائے بہادر (لارڈ کرزن) نے اپنے احکام میں حروف کا لفظ بدل کر زبان کا لفظ بنا دیا۔ وہ جو ذرا سا تسمہ لگا رہ گیا تھا ظالم نے وہ بھی کاٹ کر رکھ دیا۔

اس پر مسلمانوں میں بڑا ہیجان ہوا۔ نواب محسن الملک بہادر نے ان احکام کی ناانصافی کی طرف گورمنٹ کو توجہ دلانے کی غرض سے ایک بڑا جلسہ منعقد کرنے کی تیاری کی اور ملک کے سربرآوردہ اور تعلیم یافتہ اصحاب کو مدعو کیا۔ یہ جلسہ ۱۷ر، ۱۸ر اگست سنہ۱۹۰۰ء کو بہ مقام لکھنو بارہ دری قیصر باغ میں بڑی دھوم دھام اور جوش و خروش سے ہوا۔ ریزولیشن پاس ہوئے اور بہت مدلل اور سنجیدہ تقریریں ہوئیں۔ خصوصاً پنڈت کدار ناتھ صاحب بی۔اے وکیل بنارس نے اس ریزولیشن کی مخالفت میں نہایت معقول اور پرجوش تقریریں

کیں - مولوی کرامت حسین بھی اس جلسے میں شریک تھے - اپنی تجویز پیش کرتے وقت انھوں نے فرمایا " ای حضرات، میں اہلِ قنوط سے ہوں اور مجھ کو دل افسردہ کرنے والا پہلو بھی نظر آتا ہی، خدا کرے ایسا نہ ہو اور آپ حضرات دعا فرئیں کہ میرا اندلیشہ وسواس کی حد سے کبھی آگے نہ بڑھے - میرا اندلیشہ یہ ہی کہ ہندی ریزولیشن نے فی الحال مسلمانوں کے دلوں میں دودھ کا سا اُبال پیدا کردیا ہی۔ جو نفسے چند کا مہمان ہی - اگرچہ خدا نہ کردہ موجودہ متحدہ کوشش کا یہی انجام ہونے والا ہی تو ہمارا ادبار مستمر ہی، ہماری جہالت، ہمارا افلاس، ہماری بے عزتی، ہماری تباہی دن دونی اور رات چوگنی ہوگی، ہم ایسے ناشدنی دائرے میں ہوں گے جس کے ہر طرف ضربت علیھم الذلۃ والمسکنۃ لکھا ہوگا۔" آخر وہی ہوا جس کا دھڑکا تھا۔ اور مولانائے مرحوم کی پیشین گوئی پوری ہوئی۔ باوجودے کہ نواب محسن الملک نے اپنی تقریر میں کمال ادب وانکسار سے احکام پر نظر ثانی کی گزارش کی تھی اور قدم قدم پر مہربان گورمنٹ اور حضور لفٹنٹ گورنر بہادر کے عدل وانصاف اور نیک نیتی کی مدح سرائی اور ان کے احسانات کا شکریہ کیا تھا تو بھی حاکم کے جبروت اور غرور کو زرا سا اختلاف رائے بھی گوارا نہ ہوا اور ایسی سخت دھمکی دی کہ نواب صاحب کو یہ تحریک چھوڑتے بنی اور ساری کوششوں پر پانی پھر گیا - یہ واقعہ نہایت عبرت انگیز ہی - یہ اُردو کی بہت بڑی شکست تھی -

اس وقت سے یہ زبان جسے اب ہندی کہا جاتا ہی، ترقی کرتی چلی گئی - پنڈت مالویہ جی تے جب شدھی اور سنگھٹن کے دنگل قائم

کیے تو اس کا زور اور بڑھا اور اس مذہبی جنون سے ہندی کی اشاعت کا خوب فائدہ اٹھایا گیا۔ راجپوتانہ اور سنٹرل انڈیا کی ہندو ریاستوں میں اس وقت تک دفتروں اور عدالتوں کی زبان اُردو تھی۔ وہاں وفد بھیج بھیج کر اُردو کو اکھاڑا اور ہندی کو جمایا۔ ایک جے پور ان کی گرفت سے بچ رہا تھا۔ اس کا جو حشر ہوا وہ آپ نے دیکھ لیا۔ ایک پنڈت رام چندر شرما نامی نے مرن برت رکھا کہ جب تک تمام ریاست میں اور اس کے دفتروں اور عدالتوں میں ہندی دیوناگری حروف میں جاری نہ ہوگی اور اُردو کو دیس نکالا نہ دیا جائے گا میں برت نہیں توڑوں گا اور جان دے دوں گا۔ راجپوتانہ پراونشل ہندو سبھا اور جے پور ہندو سبھا نے اس کی حمایت میں زمین آسمان ایک کر دیا۔ اس قسم کی فاقہ کشی گاندھی کی ایجاد ہے۔ گاندھی جی اور ان کی تقلید میں بہت سوں نے مرن برت رکھے لیکن مرا ایک بھی نہیں۔ یہ مرن برت نہیں دھمکی برت ہے اور جس طرح راج کوٹ کے معاملے میں وائسرائے دھمکی میں آگئے تھے اسی طرح جے پور کے مدبر اعظم بھی دھمکی میں آگئے۔ سر انیٹنی میکڈانل نے ہندو ڈیپوٹیشن کے جواب میں کہا تھا کہ یہ تبدیلی جلد نہیں ہو سکتی۔ لیکن جے پور کے وزیر اعظم نے فرمایا جہاں تک جلد ممکن ہوگا ہندی جاری کر دی جائے گی۔ سر انیٹنی کو دیوناگری جاری کرنے میں دو سال لگ گئے۔ مگر جے پور کے وزیر باتدبیر نے چند ہی روز میں حکم ناطق نافذ کر دیا اور بے گناہ اُردو کے قتل کا فتوا سر مرزا اسمٰعیل کے دست مبارک سے لکھا گیا! انا للہ وانا الیہ راجعون

حضرات۔ پہلے یہ تنازع بہار، یو۔پی اور اس کے آس پاس

کے اضلاع میں تھا۔ لیکن گاندھی جی نے اس میدان میں قدم رکھا اور انھوں نے یہ اعلان کیا کہ میں ہندی کو اس ملک کی قومی زبان بنا کے رہوں گا اور اس کی اشاعت کا کام باقاعدہ تندھی سے شروع کردیا تو یہ آگ سارے ملک میں پھیل گئی اور اور جو نزاع ایک خاص علاقے میں محدود تھی وہ ملک کے کونے کونے میں پہنچ گئی اور ایک مقدس صلح کل اور مقبول لیڈر کی بدولت مستقل بنیاد فساد کی قائم ہوگئی جس کے اثر زبان ہی تک نہ رہے۔ بلکہ دوٗر دوٗر تک پہنچے۔ اور زندگی کا ہر شعبہ اس میں اُلجھ گیا۔ گاندھی جی ہزار تاویلیں کریں، جو کام انھیں کرنا تھا وہ کر چکے اور جو کاری ضرب اُردوٗ پر لگانی تھی لگا چکے۔

اب حالت یہ ہو کہ ہر شخص خواہ وہ اُردوٗ یا ہندی جانے یا نہ جانے اس معاملے میں رائے دینے کو تیار رہو کیوں کہ یہ معاملہ اب صرف زبان کا نہیں رہا بلکہ لسانی، تعلیمی، تہذیبی، سیاسی، معاشرتی، مذہبی سب ہی کچھ ہوگیا ہو۔ تقریباً دو ہفتے ہوتے ہیں آپ نے اخباروں میں پڑھا ہوگا کہ رائٹ آنریبل سری نواس شاستری نے مدراس میں اپنی ایک تقریر میں فرمایا کہ ہندی ایک روز اس ملک کی قومی زبان بن کے رہے گی۔ یہ ایک نہایت نرم، حلیم الطبع اور اعتدال پسند سیاست داں کا قول ہو۔ جب اینٹی میکڈانل، گاندھی جی، شاستری جی اور مرزا جی جیسے بزرگوں کے ہاتھ میں ہماری زبان کی قسمت کا فیصلہ ہو تو جو نہ ہو کم ہو۔ کچھ دن ہوئے سر تیج بہادر سپرو نے، جو اُردوٗ کے شیدائیوں میں ہیں، مجھ سے

بڑے افسوس اور حسرت سے فرمایا" ہندو اُردو چھوڑتے جاتے ہیں،
اب تک مجھے یہ توقع تھی کہ کایستھ اور کشمیری پنڈت ہمارا ساتھ دیں گے۔
لیکن افسوس وہ بھی ہٹتے جاتے ہیں۔" اُردو جو ہندستان کی تاریخ میں
ہندو مسلم اتحاد کی سب سے عظیم الشان اور مبارک یادگار ہے وہ بڑی
بیدردی سے فرقہ واری سیاست کے بھینٹ چڑھائی جا رہی ہے۔

حضرات، ہم میں ایک گروہ مذبذبین کا بھی ہے۔ وہ اُردو کے
زباں داں اور قدر داں ہیں۔ انشا پرداز اور صاحب تصانیف بھی
بھی ہیں۔ ان میں سے بعض صاحب ادارہ بھی ہیں۔ ان کے ہاتھ
میں یا ان کے [illegible] اخبار یا رسالے بھی ہیں۔ ہر چند کہ ایک مدّت سے
اُردو پر پیہم حملے ہو رہے ہیں اور حالت نازک ہو چلی ہے۔ لیکن خدا کے
یہ نیک بندے کچھ نہیں کہتے۔ سب کچھ دیکھتے اور جانتے ہیں مگر خاموش
ہیں۔ وہ نہ اُس فریق کو ناخوش کرنا چاہتے ہیں نہ اس فریق کو، وہ زبان
کھولتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ کہیں ان کی شان غیر جنبہ داری میں جھفتے
نہ پڑ جائیں۔ ممکن ہے کہ خاموشی میں وہ کوئی خاص مصلحت سمجھتے ہوں۔
اور ان کے کام کا طریقہ کوئی ایسا ہو جس کا علم دوسروں کو نہ ہو لیکن
یہ وقت کانا پھوسی کرنے یا پردے میں گفتگو کرنے کا نہیں۔ خلوت
سرائے سے نکل کر دیوان عام میں آنے کی ضرورت ہے۔ آپ شخصی
معاملات میں خاموش یا ناطرف دار رہ سکتے ہیں، لیکن قومی معاملات
میں، خصوصاً ایسے موریں جن پر قومی فلاح کا انحصار یا زیاں کا اندیشہ
ہو خاموش رہنا جرم ہے۔ یونان کے مشہور مقنن لائی کرگس نے اپنے
قانون میں نیوٹرل یعنی ناطرف دار کو غدار سے تعبیر کیا ہے اور اس کی

سزا وہی مقرر کی ہے جو غدّار کی ہوتی ہے۔ قوم کا معزز رکن ہوتے ہوئے ایسے اہم معاملے میں کوئی رائے نہ رکھنا یا مصلحتاً اس کا اظہار نہ کرنا بے معنی ہے۔

ان حالات میں ہمارا فرض صاف اور واضح ہے۔ اب ہم تماشائی بن کر نہیں رہ سکتے۔ سکوت و سکون، بے عملی و بے اعتنائی انسانوں اور قوموں کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ بقا کے لیے جد و جہد لازم ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ قوموں نے اپنی زبان کی بقا کے لیے بڑی بڑی صعوبتیں اور عقوبتیں جھیلیں اور جانیں کھپا دی ہیں۔ اگر ہم اپنی زبان کی بقا اور ترقی کے خواہاں ہیں تو ہمیں لگاتار کوشش اور محنت، سختیوں اور قربانیوں کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ بڈھا سرسیّد آخر دم تک اپنی زبان کی حفاظت کے لیے لڑتا رہا۔ ہمیں آج اسی سید احمد خانی خلوص و درد اور جوش و ہمّت کی ضرورت ہے۔ اب سنتِ سیّد کو زندہ کرنا لازم ہوگیا ہے اور اس کے لیے علی گڑھ سے بڑھ کر کون سا مقام ہو سکتا ہے جہاں وہ اپنی قوم کے لیے مردانہ وار بلکہ دیوانہ وار لڑتا رہا اور اسی دھن میں یہیں کام کرتے کرتے اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔ آج ہی اس کے مزار پر ہمیں اس عہد کو استوار کرنا چاہیے۔ جب زندوں میں ایسا کوئی نہیں تو پھر اس شہید مرد کے مزار ہی سے ہمت کیوں نہ طلب کریں؟

صاحبو۔ آخر میں اس طول بیانی کی معافی چاہتا ہوں۔ اگر کسی کو اس سے ملالِ طبع ہوا ہو تو اس الزام میں میرے ساتھ نواب صدر یار جنگ بہادر بھی شریک ہیں جن کی محبّت اور شفقّت مجھے یہاں

کھینچ لائی ہے۔ میں اس تلخ نوائی کے لیے بھی عذرخواہ ہوں جو اس تقریر میں کہیں کہیں آگئی ہے لیکن اس معاملے میں، میں مجبور ہوں۔ حیدرآباد کے ایک کرم فرمانے میرے مقدمات جمع کر کے مرتب کیے اور نواب صدر یار جنگ سے ان پر مقدمہ لکھنے کی درخواست کی۔ نواب صاحب اپنے اس مقدمہ میں ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں " اور زور ایسا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ مقدمہ لکھتے نہیں لڑتے ہیں"۔ مجھے اس کا اعتراف ہے۔ میں ہمیشہ لڑتا رہا ہوں اور یہ لڑائی اب بھی جاری ہے اور جس بات کو حق سمجھتا ہوں اس کے لیے آیندہ بھی برابر لڑتا رہوں گا۔

گفتند جہان ما آیا بتو می سازد
گفتم کہ نمی سازد، گفتند کہ برہم زن

خطبۂ صدارت

شمالی بنگال اُردو کانفرنس دیناج پور (بنگال)

۷ مارچ ۱۹۴۳ء

ای صاحبو! میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں کہ آپ نے اپنی عنایت سے مجھے اس کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی۔ میں نے آپ کے ارشاد کی تعمیل کی ہی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میں یہ سمجھتا ہوں کہ میں بنگال کے حالات سے کما حقہٗ واقف نہیں اور اس لیے مجھے اندیشہ ہی کہ اس خدمت کو جو آپ نے میرے سپرد کی ہی خاطر خواہ اور آپ کی آرزو کے مطابق انجام نہ دے سکوں۔ مگر سب سے بڑھ کر میں اس بات کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے اُردو زبان کی طرف توجہ فرمائی ہی اور اس کی ترویج کے لیے آپ جو کوشش اور جد وجہد فرما رہے ہیں وہ ہر اعتبار سے قابلِ قدر اور موجب تحسین و آفرین ہی۔ اگر آپ نے استقلال کے ساتھ یہ کوشش جاری رکھی تو آپ ایسی بڑی قومی اور ملکی خدمت انجام دیں گے جس کے لیے تمام ہندستان اور خصوصاً اُردو داں طبقہ آپ کا ہمیشہ ممنونِ احسان رہے گا۔ اور آپ اپنی اِس تحریک سے اُس مجرمانہ غفلت کی تلافی فرمائیں گے جو انگریزی حکومتِ بنگال

نے ابتدا سے اب تک اُردو کے حق میں برتی ہو۔

حضرات، مُلکِ بنگال سے مسلمانوں، فارسی اور اردو کا تعلق زمانۂ قدیم سے چلا آرہا ہو اور اس کی تاریخ نہایت دلچسپ اور سبق آموز ہو۔ یہ تاریخی زمانہ نام ور جنرل بختیار خلجی یعنی تیرھویں صدی سے شروع ہوکر اٹھارویں صدی تک رہتا ہو۔ اس میں بہت سے انقلاب رونما ہوئے غلام بادشاہوں، پٹھانوں، مغلوں کی حکومت کے دور دورے رہے۔ درمیانی زمانے میں تقریباً دو صدی تک دلّی کی مرکزی حکومت سے قطع تعلق کرکے خود یہاں آزاد خود مختار حکومتیں رہیں۔ باوجود ان تمام تغیرات و ردّو بدل کے اگر تاریخ کا مطالعہ بے لاگ اور صحیح نظر سے کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اسلامی عہد اس ملک کے لیے بڑی خوش حالی اور خیر و برکت کا باعث ہوا ہو۔ یہ موقع ان امور پر بحث کرنے کا نہیں ہو۔ یہاں ہمیں صرف زبان سے بحث ہو جس کا میں بہت مختصر طور پر ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

اُس زمانے میں جب مسلمان یہاں آئے، بنگالی زبان نہایت حقارت سے دیکھی جاتی تھی اور یہاں کے اہلِ علم اور پنڈت اسے ایک گنواری اور ناشستہ بولی خیال کرکے ناقابلِ التفات سمجھتے تھے۔ بارھویں صدی کے کرشنا پنڈت نے اسے "پیشاچی پراکرت" یعنی بھوتوں کی بولی کا لقب دیا ہو۔ سنسکرت کے ایک مشہور شلوک سے اس کی تصدیق ہوتی ہو۔ جس کا مطلب یہ ہو کہ اگر کوئی شخص اٹھارہ پران اور رامائن کو بنگالی زبان میں پڑھتے سُنے گا تو وہ جہنّم کے درجۂ اسفل میں جھونک دیا جائے گا۔" یہ بولی جو اس قدر حقیر اور ناپاک سمجھی جاتی تھی، صرف مُسلمان فرماں رواؤں اور امرا کی بدولت زبان بنی اور یہ عروج حاصل ہوا جو ہم اس

وقت دیکھتے ہیں ورنہ پنڈتوں نے اس کا خاتمہ ہی کر دیا تھا۔ بنگالی زبان و ادب کے مورخ ڈاکٹر دنیش چندر سین لکھتے ہیں ”بنگالی کو ادبی رتبے تک پہنچانے میں متعدد اثرات نے کام کیا۔ لیکن اس معاملے میں اسلامی فتح کو سب سے بلند اور مقدم درجہ حاصل ہے۔ اگر ہندو راجہ مطلق العنان فرماں روا رہتے تو بنگالی زبان کا بادشاہوں کے دربار تک رسائی پانا مشکل ہو جاتا۔“ یہی ڈاکٹر صاحب آگے چل کر لکھتے ہیں ”پٹھان فرماں رواؤں نے ان کتابوں (رامائن اور مہابھارت) کے ترجمے کے لیے ایسے علما مقرر کیے جو ان کا ترجمہ ایسی بنگالی میں کریں جو وہ بولتے اور سمجھتے تھے۔ مہابھارت کا پہلا بنگالی ترجمہ نصیر شاہ شہنشاہِ گور کے حکم سے ۱۳۲۵ء میں ہوا..... نصیر شاہ اس ملک کی دیسی زبان (بنگالی) کا بہت بڑا سرپرست تھا۔ مشہور شاعر وِدیا پتی نے اپنا ایک قصیدہ اُس کے نام سے معنون کیا ہے اور سلطان غیاث الدین کا نام بھی وہ بڑے احترام سے لیتا ہے۔“ اسی طرح شہنشاہ حسین شاہ نے ۱۴۸۰ء میں مالا دھر واسو کو بھاگوت کے بنگالی ترجمے پر مامور کیا اور اُسے گُن راج خاں کا خطاب عطا فرمایا۔ حسین شاہ کے سپہ سالار پراگل خاں نے بھی کورندا پرمیشور کو حکم دیا کہ وہ مہابھارت کا ترجمہ بنگلہ میں کرے۔ یہ ترجمہ بہت جامع اور بہتر ہے اور پندرھویں صدی کے شروع میں کیا گیا تھا۔ چند سال بعد پراگل خاں کے فرزند چھوٹے خاں نے ایک دوسرے شاعر شری کرن نندی سے اشومید پروا کا ترجمہ بنگالی زبان میں کرایا۔ سترھویں صدی عیسوی میں علاول شاعر نے حاکم اراکان کے مسلمان وزیر ماگن ٹھاکر کے حکم سے ملک محمد جائسی کی مشہور کتاب پدماوت کا ترجمہ اعلیٰ درجے کی سنسکرت آمیز بنگالی میں کیا جو بنگالی کی ”قدیم بیش بہا عالمانہ

نظموں میں شمار کیا جاتا ہے" نیز اسی وزیر کی فرمایش پر سیف الملوک و بدیع الجمال کا بھی کچھ حصہ بنگالی میں ترجمہ کیا۔ علاوہ اس کے ایک مسلمان امیر سلیمان کے حکم سے دولت قاضی کی نظموں (چندرانی اور ستی مینا) کے تتمے لکھے۔ اور نظامی کی مثنوی ہفت پیکر کا ترجمہ بنگالی میں کیا۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی کتابیں لکھیں۔ علاول کا درجہ بنگالی شاعروں میں بہت اعلا ہے لکھا ہے کہ اُسے سنسکرت زبان پر اس قدر قدرت تھی کہ بنگالی ادب میں شاید ہی کسی ہندو شاعر کو حاصل ہو۔ ایسی بیسیوں مثالیں ہیں۔

مسلمان فرماں رواؤں اور امیروں کی علمی سرپرستی اور قدر دانی سے یہ ہوا کہ دیگر والیانِ ملک اور ماتحت راجاؤں نے باوجود متعصب برہمنوں کی مخالفت کے ایسی مثالوں کی تقلید کے بغیر چارہ نہ دیکھا۔ اس طرح قدیم بنگالی علم ادب کو خوب ترقی ہوئی۔ اور مسلمان حکمرانوں کے زمانے میں اسے بے حد عروج حاصل ہوا۔ اس زبان پروری اور آپس کے میل جول کا یہ نتیجہ ہوا کہ فارسی کے ہزاروں لفظ بنگالی زبان میں گھل مل گئے۔ بہت سے سنسکرت الفاظ کی جگہ فارسی نے لے لی۔ مثلاً ٹاکا کی جگہ خزانہ۔ بھومی کی جگہ زمین، بھومیا کی جگہ زمیں دار، پرجا کی جگہ اسامی یا رعیت۔ دھرما دِھیکاری کی جگہ قاضی، نشانا تھ کی جگہ کوتوال، یا ترکی جگہ وزیر۔ نگر کی جگہ شہر، اٹالی کا کی جگہ عمارت، اسی طرح عطر، جھاڑ، دیوارگیری، مکتب تعلیم وغیرہ سینکڑوں فارسی لفظ داخل ہو گئے۔ بہ قول ڈاکٹر سین کے "اب ہزاروں فارسی لفظ بنگالی زبان میں رائج ہیں اور اکثر دیگر الفاظ کے ساتھ جو سنسکرت سے ماخوذ ہیں۔ روزمرہ کی بات چیت میں استعمال ہوتے ہیں۔ ملک کے علم ادب میں اس کا بڑا دخل ہے۔"

اس سرسری اور نہایت مختصر بیان سے ظاہر ہو کہ مسلمانوں نے کیسی بے مثل رواداری اور عالی ظرفی سے کام لیا اور بنگالی زبان کو موت کے پنجے سے نکال کر علم و ادب کی مسند پر لا بٹھایا اور ان کی بدولت فارسی زبان کے اثر نے اس میں نئی قوت و زیبایش پیدا کر دی۔ یہ اثر قدیم بنگالی ہی تک محدود نہیں رہا بلکہ بہت زمانہ بعد تک پایا جاتا ہو۔ چناں چہ ۱۸۵۰ء کے کلکتہ ریویو میں ایک انگریز نقاد رام رام باسو کی ایک کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہو کہ" اس کا طرزِ تحریر ایک قسم کی پچی کاری ہو جس میں آدھی بنگالی اور آدھی فارسی پائی جاتی ہو"؛ جسے وہ مسلمانوں کے مضر اثر سے تعبیر کرتا ہو۔ اس کی یہ رائے لغو ہو اس لیے کہ جنگ کے ہنگاموں اور درباری معاملات کے بیان کرنے کے لیے اس سے بہتر کوئی اسلوب بیان ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ یہ رام رام باسو فورٹ ولیم کالج کے متوسلین میں سے تھے اور علاوہ سنسکرت کے فارسی اور عربی میں پوری دستگاہ رکھتے تھے۔

جب تک بنگال کا تعلق دہلی کی مرکزی حکومت سے رہا۔ دہلی کے تمدّن و تہذیب اور زبان کا اثر مسلسل پڑتا رہا۔ بنگال کے صوبہ داروں کے دربار دہلی دربار کا نمونہ تھے، سرکاری اور درباری زبان فارسی تھی۔ جو لوگ دربار اور سرکار میں رسوخ حاصل کرنا چاہتے تھے انھیں فارسی سیکھنی پڑتی تھی۔ علاوہ اس کے صوبہ داروں کے مصاحب، ملازم اور درباری، بہت سے فوجی پیشہ دہلی اور اس کے اطراف و جوانب کے ہوتے تھے۔ بہت سے غیر ملازم اور تجارت پیشہ لوگوں کی آمد و رفت بھی رہتی تھی۔ ان وجوہ سے فارسی اُردو کا اثر بنگالی زبان پر پڑتا رہا۔ اور دوسرے صوبوں کی طرح بنگال بھی دہلی کی تہذیب اور زبان سے متاثر ہوئے بغیر

نہ رہ سکا۔ جب مغلیہ حکومت میں انحطاط اور ضعف پیدا ہوا تو مختلف صوبوں نے آزاد ہو کر خود مختاری حاصل کی۔ ان کے درباروں میں فارسی کے ساتھ اُردو کو بھی فروغ ہوا اور یہ فارسی اُردو کے اچھے خاصے مرکز بن گئے چنانچہ مُرشد آباد کے دربار نے اُردو کے بہت سے ممتاز شعرا کی سرپرستی کی۔ علی نقی خاں انتظار، سید امام الدین فدا، سید عبدالولی عزلت، شیخ فرحت اللہ فرحت مرزا ظہور علی خلیق، محمد فقیہ دردمند، مخلص علی خاں مخلص، ہردے رام جودت، نقی علی فراق، مرزا محمد ولی ولی وغیرہ نے اپنے افکار و اشعار سے اُردو زبان و ادب کا ذوق پھیلایا اور شعر و سخن کی بزموں کی رونق بڑھائی۔ انشاء اللہ خاں کے والد ماشاء اللہ خاں نواب مرشد آباد کے ملازم تھے اور انشاء اللہ خاں یہیں پیدا ہوئے اور یہیں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ مرشد آباد کے علاوہ ہگلی، بردوان، ڈھاکہ وغیرہ مقامات میں بھی اس کا اثر پہنچا اور وہ بھی چھوٹے چھوٹے اَدبی مرکز بن گئے۔

بنگال میں جب انگریزی اقتدار بڑھا تو کلکتے کو بڑی اہمیت حاصل ہوگئی۔ اور یہ سیاست اور ادب کا صدر مقام بن گیا۔ ہندستان کے رئیسوں کے نائب اور سفیر یہاں رہنے لگے۔ اُن کے ساتھ ان کے درباری، مُصاحب اور ملازم بھی آئے جن کی وجہ سے اُردو زبان کا خوب چرچا ہوا۔ نہ صرف بنگالی زبان پر بلکہ اہلِ بنگال کی معاشرت اور تہذیب پر بھی اس کا بہت اثر ہوا۔

بنگال میں اُردو کے اثر کی کئی وجوہ ہیں۔ یہ اثرات طرح طرح کے ہیں۔ ان میں کچھ تو بالواسطہ ہیں اور کچھ بلا واسطہ۔ اس مسئلے پر غور کرنے کے لیے ہمیں دور و نزدیک کے تمام اُن حالات پر نظر ڈالنے کی ضرورت ہے جو کسی

کسی طرح اس میں مدد و معاون ہوئے ہیں۔

۱۔ سب سے پہلے ہم وشنویوں یعنی وشنو کے پرستاروں کا ذکر کرتے ہیں جنھوں نے سولھویں صدی میں اسلام سے متاثر ہو کر اتحاد و اخوت کو قومی تنظیم کا بنیادی اصول قرار دیا۔ وشنویوں کے ادب کے حسن و لطافت کو سب نے تسلیم کیا ہے۔ رابندر ناتھ ٹیگور بھی اسی کے خوشہ چیں ہیں۔ ہندوؤں کے ساتھ مسلمانوں نے بھی علم ادب کی ترقی میں ساتھ دیا۔ اُس زمانے میں ہندو مسلمانوں میں رواداری اور یگانگت کے ایسے تعلقات تھے جن سے آج کل ہم لوگوں کو عبرت اور سبق حاصل کرنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کا اثر زبان و معاشرہی پر نہیں بلکہ مذہب پر بھی ہوا۔ ایک بنگالی فاضل کا قول ہے کہ "اگر شبھو بیٹھ اپنی تمام صفات کے ساتھ اب بھی باقی رہتا تو یقیناً بنگالہ کے تمام ہندو مسلمان ہو گئے ہوتے"۔ وشنویوں کے بڑے بڑے بزرگ اور شاعر بندرابن جا کر رہے اور وہاں والوں کی صحبت اور میل جول سے برج بھاشا کا اثر ان کی زبان پر نمایاں طور پر ہوا، اور ان کی وساطت سے برج بھاشا اور ہندستانی کے بہت سے لفظ بنگالی میں داخل ہو گئے، جو مسلک مسلمان صوفیا کا تھا وہی ان لوگوں کا تھا۔ ابتدا میں جو صوفی ہندستان میں آئے وہ ہندستان کی زبانوں سے بالکل بے بہرہ تھے چوں کہ وہ عوام میں اپنے خیالات اور عقائد کی تلقین کرنا چاہتے تھے اس لیے انھوں نے وہ زبان سیکھی جس کی آواز عوام و خواص دونوں تک پہنچ سکتی تھی۔ وہ زبان اس وقت کی اُردو تھی جسے اب ہندستانی بھی کہنے لگے ہیں۔ انھی کی بدولت ابتدائی اُردو کو اشاعت نصیب ہوئی۔ اور ملک کے مختلف علاقوں میں پہنچی۔ یہی طریقہ وشنویوں نے اختیار کیا۔ وہ اپنا عقیدہ سارے ہندستان میں پھیلانا چاہتے تھے اور اس کے لیے ایسی

زبان کی ضرورت تھی جو ہر جگہ نہیں تو اکثر جگہ سمجھی جائے۔ اسی لیے جن لوگوں کو اس نئی تعلیم کی اشاعت کی خدمت سپرد ہوتی تو انھیں لامحالہ وہ زبان سیکھنی پڑتی جو بقول ڈاکٹر سین "اُس تمام ہندستان کی جو دہلی کے مسلمان بادشاہوں کے زیرِ حکومت تھا، لنگوا فرینکا بن گئی تھی"۔ ڈاکٹر سین نے اس زبان کا نام ہندی لکھا ہے لیکن وہ ہندی نہ تھی جسے ہم آج کل ہندی کہتے ہیں، بلکہ یہ اُردو یا ہندستانی تھی جسے ابتدا میں فارسی سے امتیاز کرنے کے لیے ہندی کہتے تھے۔ یہ وشنوی بہت سے ہندستانی لفظ تحفے کے طور پر لائے اور اپنی مادری زبان کے نذر کیے۔ وشنوں کے پرستاروں کی اکثر کتابیں برج بولی میں ہیں جو اُردو کی اشاعت کا ذریعہ نہیں۔

۲۔ ہندوؤں کے بعض نہایت مقدس مقامات اس علاقے میں ہیں جو اب یو۔پی کہلاتا ہے۔ پریاگ (الہ آباد) اور کاشی (بنارس) وہیں ہیں۔ یہ ہندستان بھر کے ہندوؤں کی تیرتھ گاہ ہیں۔ جن کی زیارت ثواب بلکہ نجات کا موجب ہے۔ ان مقامات سے وہ تمدن کی نشانیاں اور زبان کے الفاظ اپنے گھروں کو لے جاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ بنگالی ان مقامات میں کثرت سے جاتے رہے ہیں۔ کیوں کہ ان شہروں میں ان کی اچھی خاصی بستیاں موجود ہیں۔ بنگال پر ان مقامات کی زبان کا اثر ہونا لازم تھا۔

۳۔ بنگال کے مسلمان فرماں رواؤں اور امرا کا جو اثر تمدن اور زبان پر پڑا اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

۴۔ زبان کے معاملے میں مدرسۂ عالیہ کلکتہ نے بھی کام کیا۔ اگرچہ وہاں عربی۔ فارسی اور دینیات کی تعلیم ہوتی تھی اور اب بھی ہوتی ہے لیکن ذریعۂ تعلیم ہمیشہ اُردو رہا۔ وہاں جو طلبا پڑھنے آتے تھے اُن کی

وساطت سے اُردو کا رواج بنگال کے مختلف اضلاع میں ہوا۔

۵۔ ایک دوسرا ادارہ جس نے فی الحقیقت اُردو زبان اور ادب کی بیش بہا خدمت انجام دی وہ کلکتے کا فورٹ ولیم کالج تھا۔ اس کالج میں اُردو کے اچھے اچھے ادیب اور اہل زبان ملازم رکھے گئے۔ ان لوگوں نے اُردو نثر میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ اور فصیح اور سلیس اُردو اور بول چال کی زبان لکھنے کا ڈول ڈالا۔ اس وقت کی لکھی ہوئی کتابیں اب بھی مطالعے کے قابل ہیں اور بعض تو ایسی ہیں کہ اُردو زبان کے دل دادہ انھیں ہمیشہ شوق سے پڑھیں گے۔ کلکتے میں جب یہ قابل قدر خدمت انجام پا رہی تھی تو ممکن نہیں کہ یہ صوبہ اس سے متاثر نہ ہوا ہو۔

۶۔ اس کے علاوہ واعظ اور مُبلّغ، صوفی اور علمائے دین جو بنگال کے مختلف حصوں میں آتے رہتے تھے ان کی وجہ سے اُردو دُور دُور کے دیہات تک میں پہنچ گئی اور اس طرح گانو والے بھی اُس کے سُننے کے عادی ہو گئے اور ان میں اس کے سمجھنے اور بولنے کا شوق پیدا ہو گیا۔ اس بارے میں مولانا سید احمد، مولانا شاہ اسمٰعیل اور مولوی کرامت علی اور ان کے پیرووں نے بڑا کام کیا۔ یہ اہل حدیث یا وہابی کہلاتے تھے۔ انھوں نے گانو کے گانو مسلمان کر لیے۔ ان کی تعلیم و تلقین کا ذریعہ اُردو تھا۔ ان کی اکثر کتابیں سادہ اُردو میں ہیں تاکہ لوگ آسانی سے سمجھ سکیں۔ واعظ جو یہاں آتے تھے وہ بھی اُردو میں وعظ کہتے تھے۔ بنگال میں اب تک میلاد وغیرہ اُردو ہی میں پڑھے جاتے ہیں۔

۷۔ بعد کے زمانے میں ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ نے بھی کچھ کم کام نہیں کیا۔ بنگال سے جو طالب علم وہاں پڑھنے آئے تھے وہ تھوڑے

ہی دنوں میں ایسی اچھی اُردو بولنے، پڑھنے اور لکھنے لگتے تھے کہ حیرت ہوتی تھی۔ اب بھی یہ خدمت مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ انجام دے رہی ہے۔ اس وقت وہاں کم وبیش ایک سو پچاس بنگالی اور آسامی طالب علم موجود ہیں۔

۸۔ صدہا بنگالی طالب علم یو۔پی اور بہار کے عربی مدارس میں تعلیم کے لیے جاتے ہیں اور اُردو کے ذریعے سے تحصیل علم کرتے ہیں وہ جب اپنے وطن لوٹ کر آتے ہیں تو درس وتدریس اور وعظ وپند میں اُردو ہی استعمال کرتے ہیں۔

۹۔ تاجر اور مزدور پیشہ بھی ایک طرح اس کام میں مدد دے رہے ہیں۔ یو۔پی وغیرہ کے بہت سے تاجر پیشہ مارواڑی وغیرہ یہاں کاروبار کرتے ہیں اور کثرت سے اُدھر کے مزدور ملوں اور کھیتوں میں کام کرتے ہیں۔ یہ سب اپنی زبان بولتے ہیں اور لازم ہے کہ اس کا اثر یہاں کی زبان پر ہو۔

اے صاحبو! جب شاہ عالم بادشاہ کے زمانے میں بنگالہ کی دیوانی ایسٹ انڈیا کمپنی کو تفویض کی گئی تو منجملہ دیگر شرائط کے ایک شرط یہ بھی تھی کہ فارسی بدستور سرکاری زبان رہے گی۔ کچھ دنوں تک تو اس کی پابندی کی گئی، لیکن جب فارسی کی جگہ اُردو نے لے لی اور تمام صوبوں کے دفتروں اور عدالتوں میں جہاں پہلے فارسی تھی اُردو کا رواج ہو گیا۔ تو حکومت بنگال نے اُردو کی طرف سے سخت بے اعتنائی کی اور اس کی نہ انصافی صرف بنگال ہی تک محدود نہ رہی بلکہ بہار میں بھی جو اس وقت احاطۂ بنگال میں شامل تھا، حکماً اُردو کی جگہ ہندی رائج کردی لیکن باوجود اس کے اپنی ذاتی صفات اور صلاحیت کی بدولت اس کی ہر دل عزیزی

پھر بھی باقی رہی۔ پرانے حالات اور اخبارات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہو کہ اس کے بعد بھی بنگال میں ہندو مسلمان دونوں یہ زبان ایک مدت تک استعمال کرتے رہے اور اس میں کتابیں لکھتے رہے۔ گارسان دتاسی اپنے ایک لکچر بابت ۱۸۶۲ء میں لکھتے ہیں "جس وقت سر جے۔ پی گرانٹ سابق لفٹنٹ گورنر یورپ واپس جا رہے تھے۔ کلکتے کے باشندوں نے ۱۶ اپریل کو ایک جلسہ منعقد کیا جس میں موصوف کی ہردل عزیزی اور خلوص کا اظہار کیا۔ جلسے کی صدارت راجا رادھا کانت دیو بہادر نے کی۔ موصوف بڑے فاضل آدمی ہیں اور ایک ضخیم سنسکرت لغت کے مصنف ہیں۔ اس موقع پر انھوں نے جو تقریر کی وہ اردو میں تھی۔ ان کی تقریر کے بعد راجا کالی کرشن بہادر کھڑے ہوئے یہ بھی مشہور مصنف ہیں اور آپ نے GAY کی کہاوتوں کا اردو نظم میں ترجمہ کیا۔ آپ نے حسب موقع اردو میں تقریر کی، نہ کہ بنگالی میں۔ ہندستان کے اخباروں سے معلوم ہوتا ہو کہ سر جان گرانٹ کی خدمت میں ایک سپاس نامہ پیش کیا گیا جس میں تشکر و احترام کے جذبات کا اظہار تھا اور ان کی گراں قدر خدمات کا ذکر تھا۔ یہ سپاس نامہ تجویز کی شکل میں جلسے میں متفقہ طور پر منظور ہوا۔ اس کے بعد راجا اپروا کرشن نے اردو میں تقریر کی۔" وہ اپنے ایک دوسرے لکچر (۱۸۶۵ء) میں لکھتے ہیں۔ "اسی طرح کلکتے کے ایک اور جلسے میں جو اس غرض سے منعقد کیا گیا تھا کہ انگلستان کے کپڑے کے کارخانوں کے مزدوروں سے اظہارِ ہمدردی کیا جائے مختلف مقررین نے ہندستانی میں تقریریں کیں۔ فرینڈ آف انڈیا میں اس کا ذکر ہو کہ راجا نرائن سنگھ نے اس جلسے میں تجاویز کی تائید اردو زبان میں کی۔

اس سے صاف ظاہر ہو کہ اردو زبان اور اسلامی تہذیب کا

اہلِ بنگال پر کس حد تک اثر تھا۔ اس میں ہندو مسلمان کی کوئی تخصیص نہ تھی
دونوں یکساں طور پر اس کے زیرِ اثر تھے۔ ہندو راجاؤں کے زمانے میں بھی ایک
عالم کے لیے عربی فارسی ہندستانی کا علم لازم تھا۔ جو برہمن درباروں میں رسائی
اور رسوخ حاصل کرنے کے متمنی ہوتے تھے وہ سنسکرت کے ساتھ عربی فارسی
ہندستانی کی بھی تحصیل کرتے اور اپنی تصانیف میں عربی فارسی ہندستانی لفظ
بلا تکلف استعمال کرتے تھے۔ اسی کا اثر ہے کہ اب بھی بنگلہ زبان میں
بے شمار الفاظ عربی فارسی اُردو کے پائے جاتے ہیں، گو ان کی صورت
شکل بہت مسخ ہو گئی ہے۔ یہ سلسلہ ایک مدت تک قائم رہا۔

لیکن اس کے بعد زمانے نے پلٹا کھایا اور نیا دور شروع ہوا۔ انگریزی
حکومت کے استقلال کے بعد زندگی میں ایسا انقلاب آیا کہ قدیم معاشرت
کے جو آثار باقی رہ گئے تھے وہ بھی مٹ گئے۔ نئی تہذیب اور تمدن کا آغاز
بڑی سرعت سے ہوا اور اخباروں اور انجمنوں اور سیاسی تحریکوں نے
پر لگا دیے۔ فارسی کے خارج ہونے کے بعد اُردو کے لیے ایک موقع تھا
لیکن ایک طرف انگریزی کے سیلابی زور نے اور دوسری طرف بنگالی زبان
کی نئی تحریک نے اِسے پنپنے نہ دیا۔ اور یہ چکّی کے دو پاٹوں میں پس کے
رہ گئی۔ مسلمان زمانے کے جدید حالات اور تغیرات سے بے خبر رہے اور
ایک مدت کے لیے بنگال میں اُن کی کوئی ہستی نہ رہی۔ بنگالی ہندوؤں نے
زمانے کا ساتھ دیا اور فارسی اُردو اور اسلامی تہذیب کو خیرباد کہا۔ یہ ان کی
باخبری اور زمانہ شناسی تھی۔ لیکن سب سے زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ
اس وقت کی حکومت نے اُردو کی طرف سے بے اعتنائی ہی نہیں کی بلکہ
مخالفت اور عداوت کا رویہ اختیار کیا۔ یہ بھی عجیب داستان ہے کہ ایک معمولی

واقعہ کو بہانہ بنا کر اُسے کچلنے کی کوشش کی گئی۔

۷ رنومبر ۱۸۷۱ء کو مظفر پور کے سنٹرل کالج کی نئی عمارت کا سنگِ بنیاد مسٹر جی کمبل لفٹنٹ گورنر بنگال نے رکھا۔ اس میں تین تقریریں ہوئیں۔ مولوی سید امداد علی نے اُردو میں اور ڈاکٹر فیلن اور مسٹر کمبل نے انگریزی میں تقریر کی۔ دورانِ تقریر میں لفٹنٹ گورنر نے مولوی سید امداد علی کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ چوں کہ میں زبان سے ناواقف ہوں اس لیے تقریر کا بہت کم حصہ سمجھ سکا اور مشکل سے یہ فرق کر سکا کہ ان کی تقریر اُردو زبان میں تھی یا فارسی میں۔ اس ضمن میں انھوں نے یہ بھی کہا کہ اُردو دلیسی زبان نہیں اور تعلیم عامہ میں اسے رواج نہیں دیا جا سکتا۔ اس سے بڑھ کر اور کیا جہالت ہو سکتی ہے کہ زبان کی ناواقفیت کا اعتراف ہے اور پھر اس پر تنقید کی جاتی ہے اور اس سے بھی بڑھ کر ستم ظریفی یہ ہے کہ اُردو دلیسی زبان نہیں۔ اس کے بعد ہی انھوں نے ۱۴ دسمبر ۱۸۷۱ء کو ایک عجیب و غریب سرکاری یادداشت شائع کی اس کا ایک اقتباس میں آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں جسے سُن کر آپ کو حیرت ہوگی۔ فرماتے ہیں:۔

"فارسی زبان کو جو ہندستان کے قدیم حکمرانوں کی زبان تھی، کلیتہً ترک کر دیا گیا ہے۔ سرکاری زبان کی حیثیت سے میرے ہندستان آنے سے قبل یہ زبان ترک کر دی گئی تھی میری خدمت کے ابتدائی ایام میں اس بات کی پوری کوشش کی گئی کہ سرکاری قوانین میں اس دوغلی زبان کے الفاظ مستعمل نہ ہوں جو فارسی انشا پردازوں کو بہت عزیز تھے۔ میرا خیال تھا کہ یہ زبان متروک ہو چکی ہے اور ہمیں ایسا کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی ہے لیکن پچھلے دنوں جب مجھے بہار جانے کا اتفاق ہوا تو مجھے یہ دیکھ کر تعجب

ہوا کہ یہ دوغلی زبان پھل پھول رہی ہو اور ہمارے قوانین ہیں اس کے الفاظ
استعمال ہو رہے ہیں اور مدرسوں میں بھی اس کی تعلیم کا انتظام ہو۔ بہار میں
جو زبان میں نے سُنی وہ نہایت خراب اور مصنوعی تھی۔ ایسی مصنوعی زبان
میں نے پہلے کبھی نہیں سُنی تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ اس قسم کی زبان
کو ہمارے مدارس میں دیسی زبان کہا جاتا ہو۔ مولوی لوگ جو زبان، مروجہ زبان
کی بجائے ہمارے مدارس میں سکھاتے ہیں وہ زبان کہلانے کی مستحق نہیں
اس زبان کے لیے "اُردو" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہو جو نہایت غیر موزوں ہو۔
میں سمجھتا ہوں کہ یہ لفظ بنگال کے محکمۂ تعلیمات نے رائج کیا ہو۔ یہ ایک ایسا
لفظ ہو جس کے معنی متعین نہیں کیے جا سکتے۔ کتابوں میں چاہے اُس زبان
کے متعلق کوئی کچھ لکھے لیکن حقیقت یہ ہو کہ اُردو زبان اہلِ دربار اور دہلی
کی طوائفوں کی زبان ہو۔ اس کو ملک کی مروجہ زبان نہیں کہ سکتے۔
میں نے پورا ارادہ کر لیا ہو کہ جہاں تک میرا بس چلے گا اس زبان کی تعلیم کو
جو ہمارے مدرسوں میں دی جاتی ہو روکنے کی کوشش کروں گا میں فارسی
زبان کے مداحوں میں ہوں۔ یہ ایک نفیس اور پُر تکلف زبان ہو۔ اگر فارسی
زبان کی تعلیم دی جائے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں بشرطیکہ حالات ایسا
کرنے کے موافق ہوں۔ لیکن بگڑی ہوئی عربی اور بگڑی ہوئی فارسی کے
میل جول سے جو زبان تیار کی گئی ہو جس میں ہندستانی کے کچھ تھوڑے
سے افعال و حروفِ فجائیہ شامل کر لیے گئے ہیں جسے اُردو کہتے ہیں،
ہرگز اس قابل کہ اس کی تعلیم دی جائے . . . .
ہم اس بات پر زور دیتے ہیں کہ بچوں کو جو زبانیں سکھائی جاتی ہیں وہ ملک
کی حقیقی زبانیں ہونی چاہییں جو عام طور پر بولی جاتی ہیں اور جنھیں عوام سمجھ

سکیں ۔ مصنوعی زبانیں سکھانے سے کوئی فائدہ نہیں جنھیں عام لوگ نہیں بولتے اور نہ سمجھ سکتے ہیں ۔ اگر جدید الفاظ کی ضرورت ہے تو میں سمجھتا ہوں یہ بہتر ہوگا کہ انگریزی الفاظ رائج کیے جائیں ۔ بجائے اس کے کہ کسی اجنبی زبان کے اجنبی الفاظ قبول کیے جائیں ۔

میں ڈائرکٹر تعلیمات کی توجہ مندرجۂ ذیل امور کی طرف مبذول کراتا ہوں ۔ (۱) اُردُو زبان ہمارے مدرسوں اور تعلیمی اداروں میں قطعی طور پر متروک ہو چکی ہے (۲) ڈائرکٹر تعلیمات اور انسپکٹران مدارس کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ اس بات کو دیکھیں کہ ہمارے مدرسوں میں کوئی ایسی کتاب تو نہیں پڑھائی جاتی جو ملک کی اصلی اور خالص زبان میں نہیں لکھی گئی ہے جس کے متعلق اوپر ذکر کیا جا چکا ہے ۔ وغیرہ وغیرہ " آخر میں لکھتے ہیں ۔ "میں نے اوپر جو کچھ ہدایات دی ہیں ان کی تعمیل تمام سرکاری عہدہ داروں پر عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے دفاتر میں سوائے مروجہ زبان کے دوسری زبان کا استعمال نہ کریں ۔ اِلّا انگریزی زبان کے ۔ انگریزی زبان جن دفاتر میں استعمال ہوتی ہے وہ علیٰ حالہ رہے گی ۔ مجھے توقع ہے کہ ہائی کورٹ کے جج میری طرح دیسی زبانوں کے غلط استعمال کے خلاف ہوں گے "۔

یہ یادداشت اس قدر جاہلانہ اور مضحکہ خیز ہے کہ اس کے متعلق کچھ کہنا اپنا وقت ضائع کرنا ہے ۔ یہ اس شخص کی تحریر ہے جو دُنیا کی سب سے بڑی وحشی زبان کا بولنے والا تھا ۔ یہ سرکاری تحریر نہیں معلوم ہوتی بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا لکھنے والا کوئی متعصب جاہل شخص ہے جسے اُردُو سے بغض للّٰہی ہے اور اُردُو کو مٹانے پر تُلا ہوا ہے ۔ سر جارج کیمبل نے اُردُو کو بنگال اور بہار سے خارج کر کے چھوڑا ۔ یہ پہلی ضرب تھی جو اُردُو

پر لگائی گئی اور اس وقت سے لے کر اب تک اس پر برابر مخالفتوں کی بوچھاڑ رہی ہے اور کوئی کوشش اور سازش ایسی نہیں جو اس کے خلاف نہ کی گئی ہو اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ حیرت یہ ہے کہ باوجود اس طوفان مخالفت کے یہ اب تک کیسے باقی رہی اور بڑھتی رہی؟ اسے اس کی فطری صلاحیت کہیے یا سخت جانی کہ یہ اب تک زندہ ہے۔ اور اگر ہمیں نے ہمت نہ ہاروی تو انشاءاللہ یہ زندہ رہے گی۔ ترقی کرے گی اور پھولے پھلے گی۔

لیکن بنگال کی حالت دوسری ہے۔ بنگال کے مسلمان انگریزی اور بنگالی کی روز افزوں ترقی اور قوت سے ایسے مرعوب ہو گئے تھے کہ کچھ نہ کر سکے۔ یہاں تک کہ ان میں ایک بڑا گروہ ایسا پیدا ہو گیا جو اُردو سے نفرت کرنے لگا اور اس کا نام تک سُننا گوارا نہ تھا لیکن اب رنگ بدلا ہوا نظر آتا ہے۔ بعض انجمنوں اور طالب علموں کی بزموں کی قراردادوں اور تجویزوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اب ایک مدت کے بعد یہ سمجھے ہیں کہ اُردو کے بغیر وہ شیرازۂ قومیت اور ملکی اتحاد کو قائم نہیں رکھ سکتے۔ یہ زندگی کے آثار ہیں اُردو بنگال میں اب بھی مردہ نہیں۔ آپ کے تعلیم یافتہ طبقے کی زبان اب بھی اُردو ہے۔ اب بھی یہاں ایسی تعداد ہے جس کی مادری زبان اُردو ہے ایک بہت بڑی تعداد ایسی بھی ہے جو اُردو سمجھتی اور بولتی ہے۔ اب بھی یہاں ایسے مقامات ہیں۔ جیسے کلکتہ، مرشدآباد، ڈھاکہ، مدناپور، مالدا، چاٹ گانو وغیرہ جہاں اُردو بولی جاتی ہے۔ یہاں اب بھی ایسے مدرسے ہیں جہاں تفسیر وحدیث وفقہ اُردو کے ذریعے پڑھائی جاتی ہے۔ یہاں اب بھی اُردو کی انجمنیں اور کتب خانے موجود ہیں۔ یہاں اب بھی اُردو کے اخبار جاری

ہیں۔ یہاں کی میلادوں اور وعظوں کی مجلسوں میں اب بھی اُردو کی آواز سُنائی دیتی ہے اور بڑی خوشی کی بات یہ ہے کہ ایک کثیر تعداد اُردو کی حمایت پر مائل ہے اور اس کی اشاعت کی شائق ہے۔ یہ سب کچھ ہوتے ہوئے ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ آپ دل پہ رکھ لیں کہ یہ کام ہر حال میں آپ کو کرنا ہے اور اس کا کرنا سب سے مقدم اور ضروری ہے لیکن یہ معمولی اور آسان کام نہیں ہے۔ اس لیے کہ بہت کچھ سر مغزن اور تردّد کرنا پڑے گا۔ بہت سی مخالفتوں کو سر کرنا اور بہت سی رکاوٹوں کو دُور کرنا ہوگا اور سخت محنت اور مشقت سہنی پڑے گی۔ اگر آپ اس کے لیے تیار ہیں تو فوراً خاص تنظیم اور سرگرمی سے اس کا آغاز کر دینا چاہیے کام شروع کرنے سے پہلے یہ سوچ لینا ضروری ہے کہ کام کس ڈھنگ سے شروع کیا جائے اور کون سی تدبیریں ایسی ہیں جو کارگر ہو سکتی ہیں۔ مجھ سے بہتر آپ اِن باتوں کو سمجھ سکتے ہیں۔ تاہم بعض تجویزیں آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ ممکن ہے کہ ان میں سے کوئی بات آپ پسند کریں اور اسے قابلِ عمل خیال فرمائیں۔

۱۔ سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ کالجوں اور مدرسوں میں اُردو کی تعلیم کا مناسب انتظام نہیں۔ مدرسہ عالیہ کلکتہ بھی اس سے بری نہیں۔ اُردو کی تعلیم بطور ثانوی زبان کے باقاعدہ ہونی چاہیے۔ گورنمنٹ کو اس طرف خاص طور پر توجہ دلائی جائے۔

۲۔ محض فارسی عربی پڑھنے سے اُردو نہیں آ جاتی۔ تمام کالجوں اسکولوں اور مدرسوں میں عربی فارسی کے معلموں کے لیے حکومتِ بنگال کا مقرر کردہ اُردو ڈپلوما کے امتحان کی کامیابی لازمی قرار دی جائے اور بغیر اس امتحان

کی کام یابی کے کسی شخص کا تقرر عربی فارسی مدرسی کی خدمت پر نہ کیا جائے۔

۳۔ اُردو ڈپلوما کے امتحان میں اول آنے والے کے لیے تمغہ تجویز کیا جائے۔

۴۔ نیز جو طالب علم یونی ورسٹی یا مدارس کے امتحان میں اُردو میں خاص امتیاز حاصل کریں۔ انھیں انعامات اور وظائف دیے جائیں۔

۵۔ سرکاری دفتروں میں اُردو درخواستوں یا اُردو مراسلت کی اجازت ہونی چاہیے۔ نیز بنگالی زبان کی ایسی درخواستیں جو اُردو رسم خط میں لکھی ہوں قبول کرلی جائیں۔ اس کے متعلق گورمنٹ سے پُرزور درخواست کی جائے۔

۶۔ مکاتب کے نصاب تعلیم میں اُردو زبان بھی ہے۔ لیکن اس کے پڑھانے کا کوئی باقاعدہ انتظام نہیں۔ حکومت کو اس طرف متوجہ کیا جائے۔

۷۔ گورمنٹ سے درخواست کی جائے کہ وہ اُردو مدرسین کے لیے ٹریننگ اسکول قائم کرے۔

یہ سات تجویزیں ایسی ہیں جن کا تعلق زیادہ تر حکومت سے ہے۔ اب میں تین تجویزیں ایسی پیش کرتا ہوں جو اُردو کی ترویج کے لیے آپ اپنی ذاتی کوشش سے عمل میں لاسکتے ہیں۔

۱۔ جہاں جہاں حالات اجازت دیں اُردو پڑھانے کے لیے دِن کے اور رات کے مدرسے قائم کیے جائیں اور جو طالب علم اُردو نوشت خواند سیکھ لیں انھیں انجمن ترقیٔ اُردو کی طرف سے سندیں دی جائیں اور اُن میں جو اچھے نکلیں انھیں انعام دیے جائیں۔

۲۔ مناسب مقامات پر انجمن کی شاخیں اور اُردو کے چھوٹے

چھوٹے کتب خانے قائم کیے جائیں

۳۔ مکاتب میں کلام پاک کے جو پارے داخلِ نصاب ہوں وہ بنگالی ترجمے کے ساتھ پڑھائے جائیں یعنی ترجمہ متن کے ساتھ ہر سطر کے نیچے ہو لیکن یہ ترجمہ اُردُو رسمِ خط میں ہو۔ یعنی زبان بنگالی اور رسمِ خط اُردُو۔ اس سے بچے بہت جلد اُردُو رسمِ خط سے مانوس ہو جائیں گے۔ اس کے بعد انھیں اُردُو کی آسان کتابیں پڑھنے میں کوئی دقت نہ ہوگی۔

میں اِس تجویز کو سب سے مقدم خیال کرتا ہوں۔ اگر اس پر عمل شروع کر دیا جائے تو اُردُو کا رواج بہت جلد اور آسانی سے ہو جائے گا۔

بنگال کے مسلمانوں کے لیے اُردُو کا سیکھنا مشکل نہیں۔ ایک تو مسلمان بنگلہ میں ہزارہا فارسی۔ عربی اُردُو کے لفظ پہلے سے موجود ہیں۔ دوسری آسانی ان کو یہ ہے کہ وہ اُردُو رسمِ خط سے بھی کسی قدر آشنا ہیں۔ کیوں کہ ہر مسلمان بچے کو ابتدا میں کلام مجید پڑھایا جاتا ہے۔ اگر تھوڑی کوشش کی جائے تو اُردُو پڑھنا لکھنا بخوبی سیکھ سکتے ہیں۔ مجھے اس کا ذاتی تجربہ ہے۔ دلّی میں متعدد عربی مدرسے ہیں اور ان میں بنگالی طالب علم بھی پڑھتے ہیں۔ مجھے یہ معلوم ہوا کہ شہر والوں سے ان کے بہت کم تعلقات ہیں۔ آپس ہی میں ملتے جلتے ہیں اور بنگالی زبان میں بات چیت کرتے ہیں۔ میں نے اُن سب کو اپنے ہاں بُلایا اور سمجھایا کہ یہ کس قدر افسوس اور عیب کی بات ہے کہ تم کئی کئی سال یہاں رہتے ہو اور پھر بھی اُردُو لکھنا پڑھنا بخوبی نہیں جانتے۔ اتنی مدت یہاں رہنے سے کیا فائدہ۔ اُن کا عذر یہ تھا کہ اُن کے مدرسوں میں اُردُو نہیں پڑھائی

جاتی۔ اس لیے میں نے ان کی تعلیم کا انتظام کیا۔ ان کی تعداد تقریباً
ڈیڑھ سو تھی۔ ان کی کئی جماعتیں بنائیں اور تعلیم کے لیے معلّم مقرر کیے
جو رات کے وقت ڈیڑھ گھنٹہ اُردو لکھنا پڑھنا سکھاتے تھے۔ چند ہی
مہینوں میں وہ لکھنے پڑھنے میں خوب مشّاق ہو گئے اور تقریریں کرنے
لگے اور مضمون لکھنے لگے۔ بعض مضمون تو ایسے اچھے تھے کہ یہ معلوم
ہوتا تھا کسی شمالی ہندوالے کے لکھے ہوئے ہیں۔

حضرات! زبان کے معاملے میں انجمنِ ترقیٔ اُردو کا مسلک بالکل
صاف اور واضح ہے۔ انجمن کسی زبان کی حریف یا مخالف نہیں۔ مقامی
اور صوبائی زبانوں کو ترقی کرنے کا وہی حق حاصل ہے جو دُنیا کی دوسری
زبانوں کو ہے۔ ہماری عین خوشی ہے کہ یہ سب زبانیں بڑھیں اور پھلیں
پھولیں۔ آپ شوق سے بنگالی زبان سیکھیے۔ یہ آپ ہی کی ساختہ پرداختہ
ہے۔ آپ ہی نے اسے ترقی دی ہے۔ اب بھی آپ اس کی ترقی میں ویسی
ہی کوشش کیجیے جیسی آپ نے پہلے کی تھی۔ ہم جو آپ سے اُردو کے
لیے اصرار کرتے ہیں اس کی وجہ یہ نہیں کہ ہم خدا نخواستہ بنگالی یا کسی زبان
کے مخالف ہیں بلکہ اس اصرار کی بڑی قوی وجہ یہ ہے کہ اس ملک میں جہاں
سینکڑوں زبانیں بولی جاتی ہیں یہی ایک ایسی زبان ہے جو سارے ملک کی
مشترکہ اور عام زبان ہونے کا حق رکھتی ہے۔ کیوں کہ یہ ہندستان کی سب سے
بڑی دو قوموں اور دو تہذیبوں سے مل کر بنی اور ہندو مسلمانوں کی متفقہ
کوشش سے بڑھی اور اس بلند رتبے کو پہنچی۔ اس نے اس وسیع برِ اعظم
کو جو منتشر حالت میں تھا ایک ملک بنا دیا، نئی تہذیب اور نیا خیال دیا۔
قومیت کی بنیاد ڈالی اور مختلف قوموں کو ایک جا کرنے میں جادو

کا سا کام کیا۔ جو کام حکومتیں نہ کر سکیں، جو کام مذہبوں سے نہ ہو سکا وہ اس نے کر دکھایا۔ کیا اس کے بعد بھی ہم آپ سے یہ کہنے کا حق نہیں رکھتے کہ اس کی اشاعت و ترقی کو آپ اپنا قومی فرض خیال کیجیے؟

حضرات! کانفرنسیں کر لینا اور تجویزیں منظور کرا لینا آسان ہے۔ کام کرنا مشکل ہے۔ اس میں کچھ شبہہ نہیں کہ آپ نے یہ کانفرنس خلوص نیت اور دلی جوش سے کی ہے۔ لیکن یہ خلوص اور جوش پائدار اور مستقل ہونا چاہیے۔ جو تجویزیں آپ اس وقت متفقہ طور سے منظور کریں، اُن پر فوراً عمل درآمد شروع کر دینا چاہیے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ آسان کام نہیں ہے۔ اس میں بہت سی مزاحمتیں، بہت سی مشکلیں اور بہت سی تکلیفیں ہیں۔ لیکن مشکل کام بھی تو انسان ہی کرتے ہیں۔ پھر ایسا مبارک کام جس میں قومی اور ملکی اتحاد کا راز ہے۔ اس موقع کو غنیمت جانیے زمانہ نازک ہے اور وقت ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔ اگر اس وقت کچھ نہ کیا تو یاد رکھیے کہ ایسا موقع پھر نہیں ملے گا۔ اسی وقت یہ ٹھان لیجیے کہ کیسی ہی مشکلات پیش آئیں اور کچھ بھی ہو جائے، اسے آپ کر کے رہیں گے۔ اور اُن پست ہمت بھائیوں کو جو اسے ناممکن اور محال سمجھتے ہیں، ممکن اور کامیاب کر کے دکھا دیجیے۔ اور سر ولفرڈ بلنٹ کا یہ شعر کبھی نہ بھولیے۔

What is the life's wealth ? to do;
its loss ?
To dream and wait.

خواب دیکھنے اور انتظار کرنے کا وقت گیا۔ اب کام کا وقت ہے۔

خطبۂ صدارت اُردو کانفرنس کالی کٹ (ملیبار)

۷ نومبر ۱۹۴۳ء

صاحبو! یہ مقام جہاں ہم آج جمع ہیں ایک تاریخی یادگار ہی۔ جس زمانے میں اس ارضِ ملیبار پر مصائب و آلام کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا، یہاں کی مخلوق پر آسمان و زمین تنگ ہو گئے تھے اور سینکڑوں خانماں برباد ہزاروں بچے یتیم اور عورتیں بیوہ ہو گئی تھیں، جن کا کوئی پرسانِ حال نہ تھا۔ اُس وقت اللہ کے ایک نیک بندے کی دینی حرارت نے جوش مارا اور اُس نے نگھروں کے لیے گھر۔ بھوکوں کے لیے کھانے اور ان کی روحانی، دماغی اور اخلاقی تربیت کے لیے تعلیم کا انتظام کیا۔ مولانا عبدالقادر مرحوم ہماری قوم میں ایک پختہ فکر، صائب الرائے اور ہم درد انسان تھے۔ انھوں نے اس کی بنیاد ڈالی اور اُن کے لائق، باغیرت اور پرجوش فرزندوں یعنی مولوی سید محی الدین اور مولوی محمد علی نے اس کی غور و پرداخت اور تنظیم و ترقی اپنے ذمے لی۔ ان دونوں بھائیوں نے جس خلوص اور ایثار سے اس خدمت کو انجام دیا وہ نہایت قابل قدر ہی۔ اس گھر کو جس کی بنیاد خالص ہمدردی اور خدمت پر ہی، قائم رکھنا اور ترقی دینا اور حوادث سے بچانا ہم سب پر فرض ہے اس سے غفلت

برتنا صریح ظلم اور کفرانِ نعمت ہوگا۔

میں اس تعلیم گاہ کی خاص طور پر اس لیے قدر کرتا ہوں کہ اس نے اُردو کو اپنے نصابِ تعلیم میں لازم قرار دیا ہے اور یہ امر بانیان مدرسہ کی دانش مندی اور دُور اندیشی پر دلالت کرتا ہے۔ اس خطے سے باہر بہت کم لوگ ماپلوں کے حالات اور معاشرت سے واقف ہیں۔ جنوبی ہند کو چھوڑ کر باقی تمام ہندستان اِس بہادر اور شریف قوم سے بے خبر ہے۔ البتہ ۱۹۲۱ء کے سانحہ جاں گداز کی وجہ سے اخباروں کے ذریعے لوگوں کو معلوم ہوا کہ ماپلا بھی ایک قوم ہے اور اسی ملک میں رہتی ہے۔ بہ قولِ ڈاکٹر عبدالحق صاحب (پرنسپل محمڈن کالج مدراس) کے جس قدر یہ علاقہ مسلمانوں کے لیے اہم ہے اسی قدر مسلمانانِ ہند اس سے ناواقف ہیں۔" اس میں قصور کسی کا نہیں، قصور ہے تو صرف اتنا کہ آپ کی اور ہماری زبان ایک نہیں۔ زبان کی مغایرت بہت بڑی مغایرت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں بانیان مدرسہ کی دانش مندی اور دُور اندیشی کی قدر کرتا ہوں کہ کہ انھوں نے اپنے تمام طلبہ کے لیے اُردو زبان کا پڑھنا اور سیکھنا لازم قرار دیا ہے۔

حضرات! اقلیم ہند میں اس خطے کو کئی باتوں میں خاص امتیاز حاصل ہے۔ عرب تاجروں کی یہاں زمانۂ قدیم سے آمد و رفت رہی۔ دوسری صدی ہجری میں مسلمان عرب تاجر یہاں پہنچے اور یہیں بس گئے۔ ملیبار کی تجارت کُلّیۃً عربوں کے ہاتھ میں آگئی۔ تمام ساحلوں پر ان کی زبردست آبادیاں تھیں جن میں سب سے اہم اور وسیع کالی کٹ میں تھی جو مسلمان عربوں کی تجارت کا بہت بڑا مرکز تھا۔ کالی کٹ کے راجا زمورن کی بحری فوج اُنھیں کے زیرِ کمان تھی اور راجا (جو ملیبار میں سب سے بڑا اور قومی فرماں روا تھا) اُنھیں کی جنگی قوت اور مدد سے اپنے حریفوں کو زیر کرنے میں کام یاب ہوا۔ یہ مسلمان

بلا شرکتِ غیرے ساری بحری تجارت کے مالک تھے اور ان کے تجارتی تعلقات طرابلس اور مراکش تک پھیلے ہوئے تھے۔ ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ ملیبار کے عرب تاجر نہایت متموّل تھے اور ان کا ایک ایک ملک التجار اُن تمام کشتیوں اور جہازوں کا مال خرید سکتا تھا جو اس وقت وہاں موجود تھے اور پھر اتنے ہی مال سے لدے ہوئے جہاز تیار کر سکتا تھا۔ ان تاجروں کے واسطے سے زمورن کے تعلقات مصر، ایران اور شمالی ہند کی حکومتوں سے بہت گہرے ہو گئے تھے۔ جیساکہ شیخ زین الدین نے اپنی تصنیف تحفۃ المجاہدین میں لکھا ہے۔ مسلمانوں کی خوش حالی اور ان کی تجارت کی ترقی ان راجاؤں کے الطاف و التفات کی بدولت تھی۔ وہ مسلمانوں کے عقائد و رسوم کا احترام کرتے تھے اور کبھی جبر و زیادتی نہ کرتے، حالاں کہ مسلمانوں کی تعداد ان شہروں میں دسویں حصے سے زائد نہ تھی۔ مسلمان بھی اپنے راجاؤں کے نہایت وفادار اور خیرخواہ تھے اور لڑائیوں میں راجاؤں کے مخالفوں سے بڑی شجاعت اور جواں مردی سے لڑے اور بڑے بڑے معرکے سَر کیے۔ ہندو رعایا سے بھی اُن کے تعلقات بڑے خوش گوار تھے۔ ہمیشہ باہم صلح و آشتی اور رواداری سے رہتے۔ اُن کے مذہبی رسوم اور آداب کا پاس کرتے اور کبھی دل آزاری کے مرتکب نہ ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوؤں کو مسلمانوں کے تموّل و اقتدار اور اثر پر کبھی رشک و حسد نہ ہوا اور نہ اُن سے کسی قسم کا اندیشہ تھا۔ بلکہ ملیبار کے راجا اُن کو تجارتی مرکز قائم کرنے کی ترغیب دیتے رہتے تھے۔ اس سے اُن کے ملک کی خوش حالی اور آبادی تھی۔

یکایک جب پندرھویں صدی عیسوی کے آخری ایام میں پرتگالیوں کا قدم ملیبار میں آیا تو اس مرفہ الحالی اور شادمانی پر اوس پڑ گئی۔ خاص کر مسلمانوں

کی تجارت و دولت کا خاتمہ ہی ہو گیا۔ ۱۴۹۸ء میں واسکوڈی گاما کا بیڑا ساحلِ کالی کٹ پر پہنچا تو سب سے پہلے گاما کی اجازت سے ایک پرتگالی دسنزایاب قیدی، نے جہاز سے اُتر کر ارضِ ملیبار پر قدم رکھا۔ پہلا شخص جس سے اس کی مڈبھیڑ ہوئی ایک تونسی مسلمان تھا۔ اس نے اس پرتگالی کو دیکھتے ہی پوچھا "تجھ پر خدا کی مار، تو یہاں کیسے پہنچا" پرتگالی ہکّا بکّا اُسے دیکھنے لگا وہ حیران تھا کہ جہاں کہیں ہم جاتے ہیں مور (مسلمان) پہلے سے موجود۔ پرتگال میں مور، سواحلِ افریقہ پر مور اور وہی مور پھر ہندستان میں۔ جب اس کی حیرت ذرا کم ہوئی تو سوال کا جواب اس نے یہ دیا کہ "ہم یہاں عیسائیوں اور گرم مسالوں کی تلاش میں آئے ہیں"۔ مطلب یہ کہ "ہم عیسائی مذہب پھیلانے اور گرم مسالوں پر قبضہ کرنے آئے ہیں یعنی وہ مبلّغ اور مجاہد بھی تھے اور مہم جو، تاجر بھی۔ انھوں نے یہ دو مقصد صلح و آشتی سے نہیں بلکہ تلوار کے زور اور عیاری و مکاری سے حاصل کیے۔ گوا کے گورنر نے (۱۵۴۵ء میں) بہت ٹھیک کہا تھا کہ ہم ایک ہاتھ میں صلیب اور دوسرے ہاتھ میں تلوار لیے ہندستان وارد ہوئے ہیں۔ ہندستان کی پرتگالی حکومت کا صحیح تصوّر اس سنگی تصویر سے بہ خوبی ہوتا ہے جو گوا میں ایوان وائس رائے کی محراب پر بنی ہوئی ہے۔ وہ ایک سینٹ (یعنی ولی) کی تصویر ہے جس کا مقدس قدم مُنھ کے بل پڑے ہوئے غریب ہندستان کی گردن پر ہے اور دستِ مبارک میں ننگی تلوار ہے جس کی نوک ہندستانی کی جانب ہے۔ اب آپ سمجھ لیجیے کہ جن کے ولی ایسے ہیں اُن کے شیطان کیسے ہوں گے۔

ملیبار کے راجاؤں نے ان پرتگالیوں سے لُطف و مہربانی کا برتاؤ کیا۔ مناسب رعایتیں کیں اور تجارت کے لیے آسانیاں دیں لیکن انھوں نے ان رعایتوں اور عنایتوں کا بہت بُرا بدلا دیا۔ اوّل اوّل زمینیں حاصل کیں اور تجارتی

مرکز قائم کیے۔ پھر کوٹھیاں بنائیں۔ کوٹھیاں بناتے بناتے قلعے تعمیر کرنے لگے اور فوجیں بھرتی کرنی شروع کر دیں۔ جب تھوڑی بہت قوت حاصل ہوگئی تو راجاؤں سے باقاعدہ معاہدے ہونے لگے۔ معاہدے کی شرطیں بڑی کڑی اور عجیب ہوتی تھیں۔ منشا یہ تھا کہ ملک میں سارا سیاسی اور تجارتی تسلط ان کا ہو اور راجا ان کے ہاتھ میں کٹ پتلی بنے رہیں۔ جو یہ قبول نہ کرتا اُس پر چڑھائی کر دیتے۔ ان شرائط میں سب سے مقدم اور اہم شرط یہ ہوتی کہ مسلمانوں سے تجارتی اجارے چھین لو اور انھیں اپنے ملک سے خارج کر دو۔ کالی کٹ کے راجا زمورن سے پرتگالیوں کی کبھی نہ بنی اور اُن کے لڑائی جھگڑے آخر تک رہے۔ ایک بار واسکوڈی گاما اپنا بیڑا لے کر کالی کٹ پر چڑھائی کے لیے نکلا۔ زمورن نے اسے یکے بعد دیگرے چار پیام بھیجے۔ آخری پیام اس وقت بھیجا جب بیڑا کالی کٹ سے چار پانچ میل رہ گیا تھا۔ ان پیاموں میں یہ تھا کہ شکایت کا موقع ہو تو جیسے ہو نہ کسی اور گاما سمجھوتے پر رضامند ہوگیا۔ لیکن اس کا اصرار یہ تھا کہ صلح نامہ لکھے جانے سے پہلے راجا اس بات کا اقرار کرلے کہ تمام مسلمان شہر سے نکال دیے جائیں۔ زمورن نے صاف انکار کر دیا کہ یہ بالکل ناممکن ہے۔ گاما نے فوراً شہر پر گولے برسانے شروع۔ اس طرح جب شاہ پرتگال نے اپنا پہلا وائس رائے بھیجا تو اسے ہدایت کی کہ وہ مسلمانوں کی تجارت کو نیست و نابود کر دے اور مسلمان تاجروں کو کالی کٹ سے نکلوا دے اور اور سلطان مصر کی بحری قوت کو بے کار کر دے۔ وجہ یہ تھی کہ بغیر اس کے وہ اپنے قوی حریف راجا زمورن پر غلبہ نہیں پا سکتے تھے۔ مسلمان سب اس کے ساتھ تھے۔

پرتگالیوں کو مسلمانوں سے قلبی عداوت تھی۔ تجارتی رقابت تو تھی ہی لیکن یوں بھی مسلمانوں سے اُن کا پرانا بغض چلا آرہا تھا کیوں کہ یورپ میں مسلمان مسیحی قوت کے قدرتی دشمن سمجھے جاتے تھے اور اس لیے وہ

نہ صرف مسلمانوں کی تجارت بلکہ ساری قوم کے مٹا دینے کی فکر میں تھے اور اسے وہ اپنا قومی اور مذہبی فرض سمجھتے تھے۔ چناں چہ جہاں کوئی مسلمان اُن کے ہاتھ پڑ جاتا تو اسے طرح طرح کی اذیتیں اور عقوبتیں پہنچا کر یا تو مار ڈالتے یا غلام بنا لیتے۔ پرتگالی نامور مورخ بیروز (Barroes) لکھتا ہے کہ "مسلمان خدا کے دشمن ہیں۔" یہ ہندستان کی پرتگالی تاریخ کا نچوڑ ہے۔ ۱۵۰۲ء کا واقعہ ہے کہ ایک بہت بڑا پرتگالی بیڑا ہندستان آرہا تھا۔ رستے میں اسے کالی کٹ کے خواجہ قاسم کے بھائی کا جہاز ملا جو مکّے سے واپس آرہا تھا۔ واسکوڈی گاما نے اسے ٹھیرا کر سارا مال و اسباب لوٹ لیا۔ پرتگالی مورّخ بڑے فخر و شان سے لکھتا ہے "کیپٹن میجر (واسکوڈی گاما) نے جہاز مال اسباب سے خالی کرانے کے بعد سخت تاکید کی کہ اس میں سے کوئی مسلمان باہر نکلنے نہ پائے اور اُس کے بعد حکم دیا کہ جہاز کو آگ لگا دی جائے۔" اگرچہ مسلمانوں نے اپنا سارا سامان اُن کے حوالے کر دینا منظور کر لیا تھا مگر ان کی خونی پیاس کو اس سے تسکین نہ ہوئی۔ اس سے بھی بڑھ کر ایک وحشیانہ حرکت اور سُن لیجیے۔ زمورن کی پرتگالیوں سے لڑائی چھڑی ہوئی تھی۔ انھی ایام میں چاول بھرے جہاز کالی کٹ آرہے تھے۔ جہاز لوٹ لیے گئے اور جہازی گرفتار کر لیے گئے۔ اس کے بعد کیپٹن میجر (گاما) نے حکم دیا کہ "تمام جہازیوں کے ہاتھ، پانو، ناک، کان کاٹ لیے جائیں اور ایک کشتی میں بھر دیے جائیں اور اسی میں زمورن کے سفیر برہمن کو جو پرتگالی بدرقے کی حفاظت میں آیا تھا، سوار کر دیا جائے۔ اس کے بعد بھی ناک، کان، ہاتھ کاٹ لیے گئے۔ ان سب ناک، کان، ہاتھ، پانوؤں کا ہار گوندھ کر برہمن کے گلے میں پہنا دیا اور اس میں ناریل کا ایک پتا بھی لگا دیا۔ یہ گویا راجا کے لیے تحفہ بھیجا جا رہا تھا کہ وہ اس کا قورما پکا کر نوش جان کرے۔" اس کے

بعد کشتی کو آگ لگا دی گئی ۔ اس قسم کے شرم ناک مظالم اور تعصب و غارت گری
کے واقعات سے ان کی تاریخ بھری پڑی ہے۔

پرتگالیوں نے مسلمانوں کی ثروت و اقتدار اور تجارت کو مٹا دیا لیکن وہ خود
بھی مٹ گئے ۔ اب ہندستان میں ان کی دو یادگاریں باقی ہیں ۔ ایک تو پرتگالی زبان
کے کچھ لفظ جو بعض ہندستانی زبانوں میں اب تک پائے جاتے ہیں ۔ حالاں کہ یہ بگڑی
ہوئی پرتگالی وہ بولی تھی جو ایک مدت تک بندرگاہوں اور یورپین ساحلی آبادیوں
میں لنگوا فرینکا کا درجہ رکھتی تھی ۔ نہ صرف دیسیوں اور یورپینوں میں بلکہ مختلف
قومیت کے یورپینوں میں بھی بول چال کا ذریعہ یہی بولی تھی ۔ لارڈ کلائو جن کے لب و
ذہن کبھی کسی ہندستانی زبان سے آشنا نہ ہوئے وہ بھی اس کے جاننے والوں میں تھے ۔
لیکن اب ہماری بعض زبانوں میں اس کے صرف چند لفظ رہ گئے ہیں اور ان کی
نسبت بھی بہت کم لوگوں کو علم ہے کہ یہ کہاں سے آئے ہیں ۔ ان کی دوسری
یادگار ان کی ذرّیات ہے جو کہیں عزت و وقعت کی نظر سے نہیں دیکھی جاتی ۔ برخلاف
اس کے ان عرب مسلمانوں کی یادگار موپلا قوم اس وقت بھی ملیبار میں اٹھارہ لاکھ
سے کم نہیں اور اپنی شجاعت و شرافت ، جفاکشی و محنت ، غیرت و ہمت کے لیے
مشہور ہے ۔ مگر باوجود اس سیرت و شمائل کے بہت پست حال اور درماندہ ہیں
اور افلاس و جہالت میں مبتلا ۔ اور نہایت افسوس کی بات یہ ہے کہ ہندستان کے
دوسرے حصوں سے کوئی لگاؤ نہیں ۔ لگاؤ ہو کیسے ، لگاؤ اور یک جہتی پیدا کرنے والی
چیز یہاں نہیں ہے ، یعنی اُردو زبان کا رواج بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے
جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں ، ابتدا میں پرتگالیوں کے دو مقصد تھے ۔ گرم مسالوں کی
تجارت پر قبضہ اور عیسائی مذہب کی تبلیغ ۔ مذہب کی اشاعت حکومت کے زور
سے بھی یا دنیاوی لالچ سے ۔ مثلاً نو عیسائیوں کو بعض محکموں میں ملازمتیں دی

جائیں۔ بحری و برّی فوج کی بھرتی سے مستثنیٰ کردیا جاتا اور چاول تقسیم کرکے اُن کی امداد کی جاتی اس قسم کے عیسائی چاول عیسائی Rice Christians کے معزز لقب سے مشہور ہوگئے تھے۔ ان ترکیبوں سے بھی کچھ زیادہ کامیابی نہ ہوئی۔ ابتدا میں جو مبلغین آئے ناکام رہے۔ البتہ ۱۵۴۲ء میں جب فرانسس زیویر (جو بعد میں سینٹ زیویر کے نام سے مشہور ہوا) یہاں پہنچا تو ہندوؤں پر اس کے زہد و ریاضت کا بہت اثر ہوا اور ایک اچھی تعداد عیسائی ہوگئی لیکن یہ عیسائی برائے نام تھے۔ زیویر ہندستان کی زبانوں سے ناواقف تھا۔ وہ صرف عقائد، دس احکام، دعا رٹوا دیتا تھا۔ بے چارے نو عیسائی اس کے ساتھ ساتھ توتے کی طرح ان الفاظ کو دُہراتے جاتے تھے۔ آخر وہ مایوس اور بیزار ہوکر جاپان چل دیا۔ اس کا قول یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ان لوگوں کے سامنے عیسائی مذہب پیش کرنا موت کا فتوا پیش کرنے کے برابر ہے۔ لیکن اس کے جانشین۔ جزسوائٹ مشنری انسانی فطرت کو اس سے بہتر سمجھتے تھے۔ انھوں نے یہاں والوں کا سا طرز ماند و بود اختیار کیا اور بڑی بات یہ کی جو کامیابی کا اصل گر ہے۔ یعنی یہاں کی زبانیں سیکھنی شروع کردیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہزارہا آدمیوں نے عیسائی مذہب قبول کرلیا۔

یہی دشواری اُن قدیم عربوں کو پیش آئی تھی جو ملیبار میں بس گئے تھے۔ اُنھوں نے اس مشکل کو یوں آسان کیا کہ ایک طرف تو نومسلموں کو عربی سکھانی شروع کی، اور دوسری طرف مقامی لوگوں میں کام کرنے کے لیے خود ملیالم زبان سیکھی۔ چوں کہ ملیالم رسم خط مسلمان عربوں کے لیے بالکل غیر مانوس اور اجنبی تھا اس لیے انھوں نے یہ ترکیب نکالی کہ ملیالم عربی خط میں لکھنے لگے۔ اس وقت بھی بعض مساجد میں ملیالم زبان کا خطبہ عربی رسم خط میں لکھا ہوا پڑھا جاتا ہے۔ یہی طریقہ ہمارے صوفیوں اور درویشوں نے اختیار کیا تھا۔ جب وہ اس ملک میں آئے تو بالکل

اجنبی تھے۔ وہ اجنبی، ان کی زبان اجنبی، ان کے طور وطریق اجنبی۔ وہ ملک کے دُور دراز مقامات میں پہنچے۔ جہاں ماحول، طرزِ معاشرت اور حالات اُن کے لیے بالکل نئے تھے۔ وہ وہاں گئے، وہاں کی زبان سیکھی اور اسی میں تعلیم وتلقین کی، جس کے اثر سے لاکھوں بندگانِ خدا حلقۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔ ان واقعات کے بیان کرنے سے میرا منشا یہ ہے کہ آپ کو معلوم ہو کہ دین و دُنیا دونوں کے معاملات میں زُبان کا کس قدر دخل ہے۔ زبان اور ادب جن میں سے خیالات ڈھل کر نکلتے ہیں۔ دماغی اور ذہنی تہذیب و تربیت کا بہت بڑا ذریعہ ہیں۔ زبان کے علم اور مطالعے نے قوموں کو ایک دوسرے کے قریب لانے اور ملانے میں بڑا کام کیا ہے۔ جہاں زبان ایک نہیں وہاں خیالات ایک نہیں وہاں دل بھی ایک نہیں۔

ہمارے ہندستان جنت نشان میں جہاں بہت سی خوبیاں ہیں وہاں کچھ عیب بھی ہیں اور سب سے بڑا عیب زبان کا ہے۔ دس بیس نہیں سیکڑوں بولیاں بولی جاتی ہیں۔ یہ مصیبت آج کی نہیں صدہا ہزار سال سے چلی آرہی ہے۔ پہلے زمانے میں ایک مشترک اور عام زبان کی چنداں ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ ہر علاقہ بجائے خود ایک ملک تھا۔ اس کی زبان بھی الگ تھی، آمد ورفت کے وسائل بھی محدود تھے۔ اس لیے مختلف علاقوں کے تعلقات بھی باہم بہت کم رہے۔ ان وجوہ سے نہ تو کوئی ایسی زبان بننے پاتی اور نہ کسی کو اس کا خیال آیا۔ ضرورت ستاتی ہے تو طرح طرح کی سوجھتی ہے، ضرورت کی خلش نہیں ہوتی تو تدبیر کی سوئیں بند ہو جاتی ہیں۔ لیکن زمانۂ دراز کے بعد حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ نامعلوم طور پر خود ہمارے ہاتھوں اس کا سامان ہو گیا۔ جس طرح دراوڑی، آریائی، یونانی، ایرانی وغیرہ قومیں اس ملک

میں آئیں۔ اسی طرح مسلمان بھی یہاں پہنچے۔ جب دہلی میں ان کی حکومت کو استقلال ہوا تو وہ یہیں بس گئے اور اسی ملک کے ہو گئے، تو ملک والوں سے میل جول بڑھنے، دن رات ایک ساتھ اٹھنے بیٹھنے، کاروبار اور معاملات میں ملنے جلنے، درباروں، لشکروں، دفتروں میں ساتھ ساتھ رہنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوؤں نے مسلمانوں کی اور مسلمانوں نے ہندوؤں کی زبان سیکھنی شروع کی۔ مسلمان ہندی لفظ اور ہندو فارسی لفظ اپنی بول چال میں استعمال کرتے کہ ایک دوسرے کی بات آسانی سے سمجھ سکیں۔ جب دو مختلف زبانوں کے بولنے والوں کو ایک جا رہنے کا اتفاق ہوتا ہے تو وہ اسی قسم کی کوشش کرتے ہیں جیسا کہ آج کل چھاونیوں میں دیکھتے ہیں۔ غرض یہ قدرت نے سامان بہم پہنچایا۔ ضرورت نے اس سے کام لیا اور ایک ایسی زبان کا ڈول پڑا جس میں ہندو مسلمان برابر کے شریک تھے۔ اس کے بننے میں نہ کسی حکومت کا ہاتھ تھا، نہ کسی بادشاہ کی اُپج، نہ پنڈتوں اور مولویوں کا فتوا اور نہ کسی انجمن یا بزم کی سعی۔ اسے ضرورت نے پیدا کیا۔ یہ وقت کا تقاضا تھا اور وقت کا تقاضا اٹل ہوتا ہے۔

ایک بڑی بات اردو کے حق میں یہ ہے کہ جہاں گئی مقبول ہوئی۔ اس کی مقبولیت فارسی اور انگریزی کی سی مقبولیت نہیں۔ فارسی حکومت کی زبان تھی۔ اس کی بدولت دربار سرکار میں رسائی ہوتی اور چھوٹے بڑے عہدے اور منصب ملتے۔ یہی حال اب انگریزی کا ہے۔ اس کی پشت پر حکومت ہے۔ دولت ہے اور دنیاوی فائدے ہیں۔ یہ دونوں باہر سے آئیں اور اہلِ ملک نے ان کی تحصیل حکومت تک پہنچنے اور دفتری خدمات حاصل کرنے کے لیے کی۔ قطع نظر ان مادی فوائد کے ان میں علمی اور تہذیبی پہلو بھی تھا۔ برخلاف اس کے اردو ابتدا میں ان سب فضیلتوں سے محروم تھی۔ یہ حکومت کی سرپرستی کی

کنوڈی تھی نہ حصولِ دولت وجاہ کا ذریعہ اور نہ اسے علمی، ادبی یا تہذیبی شان کا شرف حاصل تھا۔ لیکن باوجود اس کے حیرت انگیز سرعت کے ساتھ ملک کے دُور دراز گوشوں میں جا پہنچی۔ مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ جہاں کہیں پہنچی قبولِ عام سے سُرخ رُو ہوئی۔ مقبولیت کا ایک بڑا ثبوت یہ ہے کہ اکثر صوبے اس کے جنم بھومی کے دعوے دار ہیں۔ اہلِ پنجاب کا دعوا ہے کہ اس کی آنول نال یہیں گڑی ہے، غزنوی حکومت پنجاب میں آئی تو اس وقت اس نے وہاں جنم لیا۔ دہلی اور یو۔ پی والے کہتے ہیں کہ دلّی میں جب اسلامی حکومت کو استقلال حاصل ہوا تو دلّی میرٹھ کی آس پاس کی بولی پر فارسی کی قلم لگی اور ایک نئی بولی وجود میں آئی۔ اہلِ گجرات کہتے ہیں کہ یہ بیج یہیں اُگا، یہیں اس میں کلّے پھوٹے اور یہ سوغات یہاں سے ملک کے دوسرے حصّوں میں پہنچی۔ اہلِ دکن کا دعوا ہے کہ دکن میں اول اول اِس نے ادبی حیثیت حاصل کی اور یہاں سے شمالی ہند پہنچی۔ بعض دوسرے صوبوں کو بھی اس قسم کا دعوئی ہے۔ ان سب کے دعوے حق بجانب ہیں۔ کیوں کہ یہ کسی ایک کی زبان نہیں سب کی ہے اور پھر آپ کی کیوں نہ ہو۔

سب کی کیوں کر؟ — اگرچہ ابتدا میں ہندو مسلم میل جول سے بنی۔ لیکن جب اس کا رواج بڑھا تو دوسری قوموں نے بھی اسے خوشی خوشی قبول کیا۔ سکھ، پارسی، انگریز، یوربین، اینگلو انڈین سب ہی نے اس سے کام لیا، اس میں کام کیا اور اس کی اشاعت وترقی میں مدد دی۔ آپ کو یہ سُن کر حیرت ہوگی کہ ایک سو سے زیادہ یورپین اور اینگلو انڈین اُردو کے شاعر ہیں۔ جن میں سے بعض کے ضخیم دیوان موجود ہیں۔ ہندستان کی کوئی دوسری زبان قبولِ عام کا یہ دعوئی نہیں کرسکتی۔ اس لیے ہمارا یہ دعوا ہے کہ یہ سب کی زبان ہے

اور ہندستان کی اگر کوئی مشترک اور عام زبان ہو سکتی ہے تو یہی ہے۔

اس بنا پر ہماری یہ آرزو ہے بلکہ مصمم ارادہ ہے کہ ملیبار کی بالا آبادی کو ہم اس وسیع برادری میں شامل کریں جو ہندستان کے ہر حصے میں آپ کو خیر مقدم کہنے کے لیے تیار ہے۔ اس کا ایک ہی ذریعہ ہے، اور وہ اُردو زبان ہے۔ اس سے اخوت کا رشتہ زیادہ مستحکم اور مضبوط ہو جائے گا اور اس سے جو نتائج مرتب ہوں گے وہ بہت دور رس، کارگر اور سود مند اور ہم سب کے لیے باعثِ خیر و برکت ہوں گے۔ اس کی بدولت آپ ایسے سرچشمہ علم و ادب تک پہنچ جائیں گے۔ جہاں آپ اپنی تاریخ، تہذیب و تمدن اور مذہب کے معلومات سے جی بھر کے سیر ہو سکتے ہیں۔ یہ بات آپ کو کسی دوسری زبان میں میسر نہیں آسکتی۔ اُردو کا علمی ذخیرہ روز بہ روز بڑھتا جاتا ہے اور ادبی اور علمی ذوق رکھنے والے کے لیے معقول سامان موجود ہے۔ یہ بہت شیریں، لچک دار، موہنی زبان ہے۔ اس میں ہر قسم کے خیالات ادا کرنے کے اسلوب موجود ہیں۔ اس زمانے میں اس کی قوت اور وسعت میں بہت اضافہ ہوا ہے اور آیندہ اس کے امکانات اور بھی زیادہ ہیں۔

حریفوں نے اُردو زبان کے خلاف طرح طرح کا پروپگنڈا کر رکھا ہے۔ اور یہ مشہور کر رکھا ہے کہ یہ بہت مشکل زبان ہے۔ یہ بالکل غلط ہے۔ یہ بہت آسان زبان ہے اور آسان نہ ہوتی تو اتنی جلدی سارے ملک میں کیسے پھیل جاتی اور آپ کے لیے تو کچھ بھی مشکل نہیں۔ چوں کہ آپ رسمِ خط سے پہلے ہی واقف ہیں اور آپ کے کئی مدرسوں میں اُردو کی تعلیم جاری ہے اور عام میلان اس کی طرف پایا جاتا ہے۔

۱۹۳۷ء میں میں نے ڈاکٹر عبدالحق صاحب پرنسپل گورمنٹ محمڈن کالج

مدراس کی معیت میں اسی غرض سے ملیبار کے بعض مقامات کا دورہ کیا۔ کالی کٹ ہمارا صدر مقام تھا اور یہاں سے ہم ہر صبح روانہ ہوتے اور شب کو واپس آتے۔ حالات اور اشخاص سے واقفیت حاصل کرنے کے بعد انجمنِ ترقیٔ اُردو (ہند) نے اس علاقے میں اُردو کی ترویج کی کوشش کی۔ اس وقت یہاں انجمن کے نو مدرسے ہیں اور ٹیلچری میں انجمن کی ایک شاخ بھی ہے۔ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ یہ مدرسے جیسا کہ چاہیے ویسا کام نہیں کر رہے ہیں۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ ان کی وجہ سے اُردو کا شوق پیدا ہو چلا ہے اور ملیبار کے اکثر مقامات سے اُردو مدارس کے قیام کے لیے درخواستیں آتی رہتی ہیں۔ مگر بغیر کسی تنظیم اور معقول نگرانی کے مدرسے قائم کرنا مفید نہیں ہو سکتا۔ یہ کانفرنس جو یہاں منعقد کی گئی ہے اس کا ایک بڑا مقصد یہ ہے کہ ملیبار میں باقاعدہ طور پر اشاعتِ اُردو کے متعلق تدابیر سوچیں اور انھیں عمل میں لانے کی کوشش کریں۔ یہ امر باعثِ مسرت واطمینان ہے کہ یہاں ایسے اصحاب موجود ہیں جو اس علاقے کے حالات سے باخبر ہیں۔ انجمن ترقیٔ اُردو (ہند) کے مقاصد سے پوری ہمدردی رکھتے ہیں اور جنھیں ایسے کاموں کا کافی تجربہ ہے۔ اگر ہم نے آپس کے مشورے اور اتفاق سے کام کا کوئی ایسا خاکہ مرتب کر لیا جو قابلِ عمل ہو تو یہ بڑی کامیابی ہوگی اور اس کانفرنس کے منعقد کرنے میں جو محنت اور تگ ودو آپ نے کی ہے وہ رائیگاں نہیں جائے گی۔ اس مقصد میں بڑی اعانت اس مدرسے سے ملے گی جہاں ہم جمع ہیں۔ اس نے اُردو کی اشاعت میں قابلِ قدر کام کیا ہے۔ ملیبار کے لیے مناسب مدرسین کا دستیاب ہونا مشکل ہے۔ یہ مشکل بھی اسی مدرسے کے ذریعے حل ہو سکتی ہے۔

آخر میں سب صاحبوں سے میری یہ عرض ہے کہ اس کام کو سرسری اور اس کانفرنس کو معمولی نہ سمجھا جائے۔ یہاں ہم ایک ایسی مہم کا آغاز کرنے والے ہیں جو اپنی اہمیت اور نوعیت کے اعتبار سے بہت بڑا درجہ رکھتی ہے۔ اس میں اخلاص، محنت اور سرمائے کی ضرورت ہے۔ اس تجویز کے یہ تین بڑے ارکان ہیں۔ اگر ہم نے صحیح اصول پر اپنے منصوبے کی داغ بیل ڈال لی اور عملی دشواریوں پر قابو حاصل کر کے اس مہم کو سَر کر لیا تو یہ کانفرنس ایک یادگار کانفرنس ہوگی۔
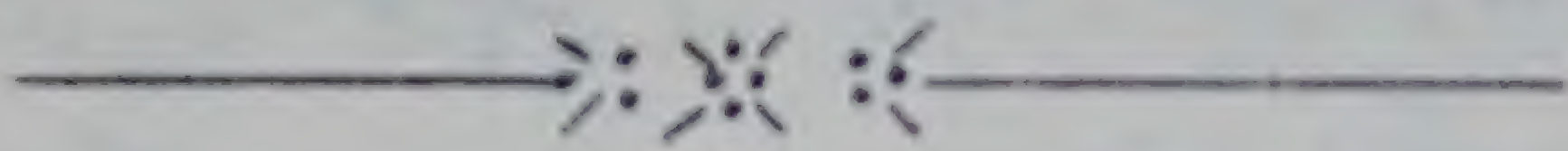
مخلوط زبان

(یہ مقالہ انجمن روحِ ادب الہ آباد کے اجلاس منعقدہ ۲۱ر دسمبر ۱۹۴۱ء میں پڑھا گیا)

جناب صدر و حضرات!

اُردو پر ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہی کہ یہ مخلوط زبان ہی۔ یہاں کی خالص زبان نہیں۔ دو غلی ہی۔ اس سے تو کسی کو انکار نہیں ہو سکتا نہ یہ ٹھیٹ ہندستانی زبان ہی اور سوا ہندُستان کے کسی دوسرے مُلک میں نہیں بولی جاتی۔ اب رہی یہ بات کہ یہ مخلوط ہی، تو مخلوط ہونا کوئی عیب نہیں، بلکہ ایک اعتبار سے خوبی ہی۔

یوں تو دُنیا میں کوئی زبان خالص نہیں۔ ہر زبان نے کسی نہ کسی زمانے میں دوسری زبانوں سے کچھ نہ کچھ لفظ لیے ہیں، یہاں تک کہ جو زبانیں مقدس کہلاتی ہیں وہ بھی اچھوتی نہیں۔ لیکن جسے ہم مخلوط زبان کہتے ہیں اس کی خاص حیثیت ہوتی ہی۔ مخلوط زبان سے مُراد وہ زبان ہی جو دو زبانوں کے آپس میں گھُل مل جانے سے ایک نئی صورت اختیار کر لے اور اس کا اطلاق ان دو زبانوں میں سے کسی پر بھی نہ ہو سکے جس سے مل کر وہ بنی ہی۔ اس کی مثال بعینہٖ ایسی ہی جیسے دوا اجزا کیمیائی طور سے اس طرح ترکیب دی جائیں کہ وہ اپنی ہیئت، تاثیر اور خاصیت میں ایک نئی چیز بن جائیں۔ اب اس کا اطلاق اُن دوا اجزا میں سے کسی پر بھی نہ ہو سکے گا۔ یہی حال اُردو کا ہی جو فارسی اور ہندی

کے سنجوگ سے بنی لیکن اب ہم اسے نہ تو ہندی کہہ سکتے ہیں اور نہ فارسی۔ اُردو ہی کہیں گے۔

اس قسم کی مخلوط یعنی کھچڑی زبانوں کے وجود میں آنے کے کئی سبب بیان کیے گئے ہیں۔ منجملہ اُن کے ایک ملک گیری ہے۔ ایک مُلک گیری تو یہ ہوتی کہ حملہ آور آیا اور لُوٹ کھسوٹ کے چل دِیا۔ دوسری قسم ملک گیری کی یہ ہے کہ فاتح نے کسی ملک کو فتح کرکے اس کا الحاق اپنے ملک سے کرلیا یعنے اُسے اپنی سلطنت کا صُوبہ بنالیا۔ پہلی صورت میں ظاہر ہے کہ فاتح قوم کا کوئی اثر مفتوح قوم پر نہیں ہوتا اور اگر ہوتا بھی ہے تو نہایت خفیف اور عارضی جو قابلِ اعتبار نہیں۔ دوسری صورت میں یا تو یہ ہوتا ہے کہ فاتح جبراً اپنی زبان اُس دیس میں جاری کردیتا ہے یا اُسے اپنے حال پر چھوڑ دیتا ہے۔ دونوں صورتوں میں زبان کے مخلوط ہونے کا امکان نہیں ہوتا۔

لیکن ملک گیری کی ایک تیسری قسم بھی ہے وہ یہ کہ فاتح مفتوح ملک میں آکر بس جاتا اور اس ملک کی قوم سے رِل مِل کر زندگی بسر کرنے لگتا ہے۔ اس کا اثر دیرپا اور مستقل ہوتا ہے اور اس صورت میں دو قوموں کے ملنے سے اُن دونوں کی زبانوں میں بھی ٹکر ہوتی ہے۔ اگر فاتح میں رواداری ہے اور مفتوح سے برابر کا برتاؤ کرتا ہے تو دونوں کے ملنے سے ایک نئی تہذیب اور نئی زبان پیدا ہو جاتی ہے۔ اُسے ہم نہ فاتح کی تہذیب اور زبان کہہ سکتے ہیں اور نہ مفتوح کی۔ بلکہ ان میں دونوں کی تہذیبیں اور زبانیں برابر کی شریک ہوتی ہیں اور دونوں قومیں اس کی بانی اور اس کی

وارث ہوتی ہیں۔ اگر یہ نہیں تو پھر کسی مخلوط زبان یا تہذیب کے پیدا ہونے کی گنجایش نہیں ہوتی۔ مثلاً انگریز اس ملک میں ڈیڑھ دو سو برس سے حکم راں ہیں اور انگریزی کا رواج بھی ملک بھر میں غیر معمولی طور پر پایا جاتا ہی۔ دفتروں، عدالتوں، اسکولوں، کالجوں، اسمبلیوں، کونسلوں اور تجارت خانوں میں اسی کا رواج ہی۔ یہاں تک کہ ذریعۂ تعلیم بھی انگریزی ہی اور باوجودے کہ وہ گھر گھر پہنچ گئی ہی اس پر بھی وہ یہاں اپنا گھر نہ کرسکی اس کا اثر ہماری زبانوں پر ضرور ہوا اور بہت کچھ ہوا لیکن اس نے ہماری کسی زبان سے میل نہ کھایا، اس لیے کہ حکومت کے غرور اور قومی وقار نے انگریزوں کو ہندستانیوں سے الگ الگ رکھا اور وہ یگانگت اور معاشرتی بے تکلفی جو ہم مذاقی اور ہم آہنگی سے پیدا ہوتی ہی نہ ہونے پائی۔ اور تیل پانی کا ملاپ نہ ہوسکا۔ مولانا حالی کا قول صحیح نکلا:-

سانپ سے جس طرح رہتا ہی سپیرا دُور دُور
حکم راں تیرے یونہیں تجھ سے رہیں برکراں

لیکن مسلمانوں کی حالت جُدا تھی۔ انھوں نے ہندستان فتح کیا اور کچھ عرصے کے بعد یہیں بس گئے اور یہیں کے ہوگئے اور جب دلّی میں ان کی حکومت کو استقلال ہوا اور اُن میں اور اہلِ مُلک میں ربط ضبط بڑھا تو اس کے ساتھ ساتھ فارسی اور مقامی زبان میں بھی ربط ضبط بڑھتا گیا اور جیسا کہ دستور ہی کاروباری اور ملکی اور معاشرتی ضرورت سے مسلمان بول چال میں ہندی لفظ استعمال کرنے کی کوشش کرتے اور ہندو فارسی لفظوں کی۔ ہوتے ہوتے بغیر کسی

اراد ے اور خیال کے خود بہ خود ایک نئی زبان کا ڈول پڑنا شروع ہو گیا۔ اس وقت کون کہہ سکتا تھا اور کسے معلوم تھا کہ آیندہ یہ دوغلی بولی جسے اہلِ علم اور اہلِ فکر حقیر سمجھتے تھے ایک دن مسندِ ادب وانشا پر جلوہ گر ہوگی۔

مخلوط زبان میں ہوتا یہ ہے کہ" غیر زبان جو کسی قوم کو سیکھنی پڑتی ہے مخلوط نہیں ہوتی بلکہ اس کی اپنی زبان غیر زبان کے میل سے مخلوط ہو جاتی ہے۔ بعینہٖ یہی حال مسلمانوں کے آنے کے بعد ہوا۔ فارسی مخلوط نہیں ہوئی بلکہ مقامی زبان فارسی سے مخلوط ہو کر ایک نئی زبان بن گئی اور ہندی میں فارسی مخلوط کرنے والے ہندو تھے۔

بات یہ ہے کہ جب کبھی ہم غیر زبان کے سیکھنے یا بولنے کی کوشش کرتے ہیں تو اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ ہماری اپنی زبان کا کوئی لفظ نہ آنے پائے۔ ہماری کوشش ہمیشہ یہ ہوتی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو صحیح اور فصیح زبان بولیں اور اس بات کی سخت احتیاط کرتے ہیں کہ ہماری گفتگو یا تحریر میں ہماری زبان کے الفاظ یا طرزِ ادا کا شائبہ نہ پایا جائے۔ غیر زبان کے بولنے یا لکھنے میں ہم جس بات سے اس قدر پرہیز کرتے ہیں اُس کا ہم اپنی زبان میں مطلق خیال نہیں کرتے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھیے کہ جب کوئی ہندستانی، انگریزی بولتا یا لکھتا ہے تو تاامکان اپنی گفتگو یا تحریر میں اپنی زبان کا لفظ یا اسلوبِ بیان نہیں آنے دیتا اور جہاں تک ہوسکتا ہے اہلِ زبان کی تقلید کرتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ انگریزی لب و لہجے کی نقل اتارنے کی بھی کوشش کرتا ہے۔ شروع میں تو بعض

ہندستانی جنھیں انگریزی بہت چڑ گئی تھی اپنی زبان بھی انگریزی لہجے میں بولنے لگے تھے)۔ برخلاف اس کے اپنی زبان میں بیسیوں انگریزی لفظ بلا تکلف استعمال کر جاتا ہے۔ یا تو اس سے اپنی مشیخت یا علمی فضیلت جتانی مقصود ہوتی ہے یا پھر ناواقفیت اور کاہلی کی وجہ سے ایسا کرتا ہے۔ ناواقفیت اس لیے کہ اپنی زبان سے پوری طرح واقف نہیں اور کاہلی اس معنے میں کہ اُسے اتنی توفیق نہیں ہوتی کہ اپنی زبان میں ان کے مترادف تلاش کرے۔ اس میں وہ کسی قدر مجبور بھی ہے۔ فاتح قوم کی زبان کے متواتر مطالعے، لکھنے، بولنے اور سُننے سے معمولی اور عام ضروریات کے لفظ بھی اس کی زبان پر اس طرح چڑھ جاتے ہیں کہ بلا ارادہ بھی اپنی زبان میں بول جاتا ہے۔ چناں چہ تیس چالیس برس پہلے سویلزیشن ریفارم، پولیٹکل، سیلف رسپکٹ وغیرہ الفاظ ہماری زبان میں عام ہو گئے تھے۔

یہ عام اصول ہندستان کے اسلامی عہد میں بھی حرف بہ حرف عمل میں آیا۔ ملکی تسلط کے وقت فاتح قوم کی زبان فارسی تھی۔ امرا، بادشاہ، دربار اور دفتر میں رسائی کا بڑا ذریعہ یہی زبان تھی اور جیسا کہ ہونا چاہیے اور ہوتا آیا ہے اہلِ ہند نے فارسی سیکھنی شروع کی اور ایسی سیکھی کہ اُستاد ہو گئے۔ فارسی کا جاننا حصول علم و معاش ہی کی خاطر نہ تھا بلکہ فارسی تہذیب و شائستگی کی علامت سمجھی جاتی تھی اور جیسا کہ دستور ہے فیشن میں داخل ہو گئی تھی۔ متواتر مطالعے، انشا وشعر و سخن کی مشق سرکاری اور دفتری نوشت و خواند کی وجہ سے اہلِ ملک کی طبائع میں ایسی رچ گئی تھی کہ انھوں نے فارسی لفظ

ملکی زبان میں بلا تامّل داخل کرنے شروع کر دیے۔

یہ بھی ایک مسلّم اصول ہو کہ غیر زبان کے لفظ جو کسی زبان میں داخل ہو جاتے ہیں یا کسی زبان کو مخلوط کرتے ہیں تو وہ اصلی زبان کی صرف و نحو کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ یہی صورت اس مخلوط زبان اُردو میں پیش آئی کہ فارسی کا اثر اسماء، وصفات تک رہا۔ البتہ بعض حروف عطف مثلاً: اگر، مگر، اگرچہ، لیکن وغیرہ آگئے۔ اصل صرف و نحو بالکل دیسی زبان کی رہی اور جب ضرورت پڑی فارسی، عربی لفظوں کو ہندی قالب میں ڈھال کر اپنا بنا لیا۔ مثلاً عربی الفاظ: بَدَل، کفن، دفن، قبول، بحث سے بدلنا، کفنانا، دفنانا، قبولنا، بحثنا مصدر بنا لیے اسی طرح فارسی سے بخشنا، فرمانا، نوازنا، داغنا وغیرہ بنا لیے گئے۔ یہ سب اُردو ہو گئے، فارسی عربی نہیں رہے۔

زبان کے خالص ہونے کا خیال درحقیقت سیاسی ہو لسانی نہیں۔ اس کا باعث قومیّت کا بیجا فخر اور سیاسی نفرت ہو۔ جرمنوں نے فرانسیسی لفظوں کے خلاف جہاد کیا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک مدت تک اُن کے مُلک میں فرانس کا ادبی اور سیاسی تسلّط رہا۔ یہ خیال اُن کے دل میں کھٹکتا تھا اور اس غصّے میں انھوں نے فرانسیسی لفظ نکالنے شروع کیے۔ اسی طرح اور اسی بنیاد پر زکس نے جرمنی لفظوں اور یونانیوں نے ترکی لفظوں کا اخراج شروع کیا۔ سیواجی کے زمانے میں مرہٹی سے فارسی لفظوں کے خارج کرنے کی تحریک ہوئی۔ آئرلینڈ میں محض انگریزوں کی مخالفت میں آئرش زبان کے زندہ کرنے کی جدوجہد جاری ہوئی۔ ترکوں نے عربی فارسی لفظوں پر ہاتھ صاف کرنا شروع کیا۔ ایرانیوں نے

بھی ایک زمانے میں عربی لفظوں کے نکال دینے کی کوشش کی تھی مگر ناکام رہی مگر اب ترکوں کی دیکھا دیکھی عربی لفظوں کے نکال دینے پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ ان سب کی تہ میں سیاسی غم و غصہ ہے۔ اگر بدگمانی نہ سمجھی جائے تو غالباً یہی خیال بعض جماعتوں میں ہماری زبان سے عربی فارسی الفاظ کے اخراج کا محرّک ہے۔ لفظ جب ایک بار زبان میں آ گیا اور رائج ہو گیا تو وہ ہمارا ہو جاتا ہے۔ غیر نہیں رہتا اُسے غیر سمجھ کر نکال دینا سخت بے دردی ہے۔ وہ اب جائے تو کہاں جائے۔ کیوں کہ اب اس کا رنگ روپ بدل گیا ہے، بعض وقت اس کا تلفظ اور مفہوم بھی کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ اصلی وطن میں تو اس کا ٹھکانا نہیں رہا اور یہاں سے دیس نکالا مل گیا۔ اس کی حالت یہودیوں کی سی ہو جاتی ہے یعنے نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔ زبان میں یہ ہٹلری جائز نہیں۔ مثلاً منصوبے کا لفظ ہے تو عربی نسل کا مگر ہماری زبان میں اس کے معنے ہی اور ہو گئے ہیں۔ ارادہ، تجویز وغیرہ۔ یہ اس ہیئت اور معنوں میں اردو لفظ ہے اور اسے نکالنے کا ہمیں کوئی حق نہیں۔ یہی حال اور بہت سے لفظوں کا ہے جو ہماری زبان میں آ کر ہمارے ہو گئے ہیں۔ مثلاً: تماشا، تلاش وغیرہ جن کے معنے اصل زبان میں کچھ اور ہیں اور ہماری زبان میں کچھ اور۔

ان وطن پرستوں کا یہ خیال ہے کہ بدیسی لفظوں سے ہماری زبان ناپاک اور خراب ہو جائے گی۔ ہمارے قومی احساس کو ٹھیس لگے گی۔ اس سے ہماری زبان کی بے مائگی ظاہر ہو گی۔ نیز غیر زبانوں کے الفاظ سے زبان بوجھل اور بھدّی ہو جائے گی۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ بدیسی لفظوں سے زبان خراب

نہیں ہوتی بلکہ برخلاف اس کے اس میں وسعت اور قوت اور شان پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ بہت سے غیر ضروری الفاظ بھی باہر سے آکر داخل ہو جاتے ہیں۔ غیر ضروری سے میری مراد اُن لفظوں سے ہے کہ جن کے ہم معنی لفظ پہلے سے زبان میں موجود ہیں۔ لیکن مترادف الفاظ سے کوئی نقصان نہیں بلکہ زبان میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اور زبان کی فطرت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ ایک مدت کے استعمال کے بعد مترادف الفاظ کے مفہوم میں خود بخود ایسے نازک فرق پیدا ہو جاتے ہیں جس سے زبان کی لطافت بڑھ جاتی ہے۔ اور وہ لفظ جو پہلے غیر ضروری سمجھے جاتے تھے ضروری ہو جاتے ہیں۔

یہ خیال بھی صحیح نہیں کہ بدیسی الفاظ سے زبان بوجھل اور بھدّی ہو جاتی ہے۔ وہ لفظ جو غیر زبان سے آکر داخل ہو جاتے ہیں وہ اس نوعیت کے ہوتے ہیں کہ زبان میں پوری طرح کھپ جاتے ہیں اور اُن کی اجنبیت بالکل جاتی رہتی ہے اور اُن میں اور دیسی لفظوں میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ اس لیے وہ زبان پر بار نہیں ہوتے بلکہ اس میں آسانی اور وسعت پیدا کرتے ہیں۔

انسانی خیال کی کوئی تھاہ نہیں اور نہ اس کے تنوّع اور وسعت کی کوئی حد ہے۔ زبان کیسی ہی وسیع اور بھرپوُر ہو، خیال کی گہرائیوں اور باریکیوں اور نازک فرقوں کو صحت کے ساتھ ادا کرنے میں قاصر رہتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اُن کے ادا کرنے کے لیے طرح طرح کے جتن کیے جاتے ہیں۔ مترادف الفاظ ایسے موقعوں پر بہت کام آتے ہیں۔ مترادف الفاظ سب ہم معنے نہیں ہوتے،

اُن کے مفہوم اور استعمال میں کچھ نہ کچھ ضرور فرق ہوتا ہی۔ اِس لیے ادائے مطالب میں ان کی اہمیت بڑھ جاتی ہی۔

خاص کر شاعری کے اغراض کے لیے مترادف الفاظ کا کثرت سے ہونا بہت کام آتا ہی۔ شاعر اُن کے ذریعے سے لطیف سے لطیف خیال اور نازک سے نازک جذبات کو ادا کر سکتا ہی۔ پھر اُسے ردیف وقافیے کے لیے بہت سہولت ہوجاتی ہی۔

ادیب اور شاعر کے لیے لفظ کا انتخاب بڑی اہمیت اور قدروقیمت رکھتا ہی۔ ایک برمحل صحیح لفظ کا انتخاب کلام میں جان ڈال دیتا ہی۔ مخلوط زبان میں انتخاب کی بہت گنجایش ہوتی ہی۔ ذوقؔ کا شعر ہی:-

مزے جو موت کے عاشق بیاں کبھو کرتے
مسیح وخضر بھی مرنے کی آرزو کرتے

خاصا شعر ہی مگر کوئی خاص بات نہیں۔ میر تقی میرؔ اسی مضمون کو یوں ادا کرتے ہیں:-

لذّت سے نہیں خالی جانوں کا کھپا جانا
کب خضر و مسیحا نے مرنے کا مزا جانا

یہاں "کھپا جانا" کے لفظ نے کیا کام کیا ہی! کوئی دوسرا لفظ رکھ کر دیکھیے یہ بات نہیں آنے گی۔ اسی شعر میں 'لذّت' اور 'مزہ' دو مترادف لفظ ہیں اگر ایک ہی لفظ دونوں جگہ استعمال ہوتا تو شعر سُست اور بے مزہ ہوجاتا:-

محبّت ہی یا کوئی جی کا ہی روگ
سدا میں تو رہتا ہوں بیمار سا

ہماری زبان میں مرض، بیماری، روگ عارضہ مترادف ہیں۔لیکن ایک سچا شاعر یا ادیب خوب سمجھتا ہے کہ کون لفظ کہاں استعمال کرنا چاہیے اسی شعر میں جی کے ساتھ "روگ" کی جگہ مرض یا بیماری یہ لُطف نہ دے گا۔

غرض فارسی کے میل سے ہماری لُغت میں بے بہا اضافہ ہوا ہے۔ الفاظ کے ساتھ ساتھ خیالات بھی آجاتے ہیں صرف لفظوں کا ذخیرہ کوئی چیز نہیں، بڑی چیز اُن کا استعمال ہے جو خیال کے صحیح طور پر ادا کرنے میں ہے۔ مترادفات کے نازک فرق، خیالات میں صفائی اور صحت بیان پیدا کرنے میں بڑی مدد دیتے ہیں۔ اور یہ نہ بھی ہو تو ایک فائدہ یہ ہے کہ باربار ایک لفظ کے اعادے سے جو بیان میں بھدا پن آجاتا ہے وہ رفع ہو جاتا اور کلام میں حُسن پیدا ہو جاتا ہے۔

اگر زبان کی قدر و منزلت اُن مقاصد کے پورا کرنے میں ہے جن کے لیے زبان بنی ہے تو ہمیں اس امر کو ماننا پڑے گا کہ غیر زبان کے الفاظ داخل ہونے سے ہماری زبان کو بے انتہا فائدہ پہنچا ہے عوام کی زبان یعنے کھڑی بولی جس پر اُردو کی بُنیاد ہے اس قدر محدود تھی کہ اگر اس میں فارسی عنصر شریک نہ ہوتا تو وہ کبھی علم و ادَب کے کوچے سے آشنا نہ ہوتی اور اس وقت جو اُردو میں اظہار خیال کے نئے نئے ڈھنگ پیدا ہو گئے ہیں وہ ان سے محروم رہتی۔

اُردو میں ہندی اور فارسی لفظ رل مِل کر شیر و شکر ہو گئے ہیں اور عام بول چال، محاوروں اور کہاوتوں میں بے تکلف آ گئے ہیں۔ مثلاً تم کس باغ کی مولی ہو۔ اِکّے دُکّے کی خیر۔ اشرفیاں لُٹیں اور کوئلوں پر مُہر۔ ایک آنکھ میں شہد ایک آنکھ میں زہر، لاکھ کا گھر

خاک ہو گیا، اللہ کا دِیا سر پر، خُدا کی لاٹھی میں آواز نہیں۔ بد اچھا بدنام بُرا، بدن پر نہیں لتّا پان کھائیں البتہ، باہمن مشری بھاٹ نوص، اس راجا ہوتے ناس وغیرہ وغیرہ سیکڑوں کہاوتیں ہیں۔ یہی حال محاوروں کا ہی مثلاً:

اللہ بیلی، آنکھوں میں خار لگنا، خُدا لگتی کہنا، آنکھوں پر پردہ پڑ جانا، لہو لگا کے شہیدوں میں ملنا، اللہ میاں کی گائے۔

مخلوط زبان میں ایک آسانی مرکّب الفاظ کے بنانے میں بھی ہوتی ہی۔ دیکھیے ہندی فارسی کے میل سے کیسے اچھے اچھّے مرکّب لفظ بن گئے ہیں مثلاً دل لگی، نیک چلن، جگت اُستاد، بھتیج داماد، گھر داماد، سمجھ دار، گنڈے دار، اُگال دان، عجائب گھر، کفن چور، جیب گھڑی، امام باڑہ، مونھ زور وغیرہ وغیرہ ہزاروں مرکّبات ہیں.

مخلوط زبانوں کے بننے کے دوران میں ایک اور بات بھی عمل میں آتی ہی جو قابلِ غور ہی۔ یعنے اُن میں سے ہر زبان کو اس خیال سے کہ جانبین کو ایک دوسرے کی بات آسانی سے اور جلد سمجھ میں آجاتے۔ اپنی بعض خصوصیات ترک کرنی پڑتی ہیں اور صِرف ایسی صورتیں باقی رکھنی پڑتی ہیں جو یا تو مشترک ہوتی ہیں یا جن کا اختیار کرنا دونوں کے لیے سہل ہوتا ہی اور اس طرح دونوں میں ایک توازن سا پیدا ہو جاتا ہی جو فریقین کے لیے سہولت کا باعث ہوتا ہی۔ اُردو کے بننے میں بھی یہی ہوا۔ فریقین یعنے ہندو مسلمان دونوں نے اپنی اپنی زبانوں میں کتر بیونت کی۔ اپنی مخصوص خصوصیات ترک کیں اور اس قربانی کے بعد جو نئی زبان

بنی اُسے اختیار کر لیا جو اب بھی ہماری ملکی اورقومی زبان ہے اور ہندستان کی مشترک اور عام زبان ہونے کا درجہ حاصل کر چکی ہے۔ ہم نے اِسے قربانی کر کے حاصل کیا ہے اورکسی کا مونھ نہیں ہوسکتا کہ ہم سے چھڑائے۔

ایک حکیم کا قول ہے کہ" غیر اقوام کے لوگوں کو اپنی قوم میں اس طرح جذب کر لینا کہ اپنے اور غیر میں امتیاز نہ رہے بلا شبہ مشکل ہے لیکن غیر زبان کے الفاظ کو اپنی زبان میں اس طرح جذب کر لینا کہ معلوم تک نہ ہو کہ یہ غیر ہیں اُس سے بھی زیادہ مشکل کام ہے" یہ استعداد اُردو میں بہ درجۂ کمال موجود ہے۔ اس میں سیکڑوں ہزاروں لفظ غیر زبانوں کے اس طرح گھُل مِل گئے ہیں کہ بولنے اور پڑھنے والوں کو خبر تک نہیں ہوتی کہ دیسی ہیں یا بدیسی، اپنے ہیں یا پرائے۔

غرض ہماری زبان ایک خوش اور ہرا بھرا گُل دستہ ہے جس میں رنگ برنگ کے خوب صورت پھول اور نازک پتیاں ہیں۔ کیا ہم اس وہم سے کہ اس میں گلاب بدیسی ہے اور کچھ پتیاں باہر کے پودوں کی ہیں انھیں نوچ کر پھینک دیں گے؟ اگر کوئی ایسا کرے تو سراسر نادانی ہے۔

مجھے سر تیج بہادر سپرو کے اس قول سے حرف بہ حرف اتفاق ہے کہ" یہی زبان جسے ہم اُردو کہتے ہیں تنہا وسیلہ ہے جس سے ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کی تہذیب کو سمجھ سکتے ہیں۔ یہی وہ ذریعہ ہے جس سے ہندو مسلمانوں میں اتحاد پیدا کیا جا سکتا ہے۔ میرے خیال میں اس سے بڑھ کر کوئی غلطی نہیں ہوسکتی کہ اس زبان کو مٹانے اور اس رشتے کو توڑنے کی کوشش کی جائے"۔

ہندی اُردو کا جھگڑا

(ایڈیٹر صاحب وشال بھارت نے اپنے ایک مضمون کی طرف خاص طور سے ڈاکٹر عبدالحق صاحب کی توجہ مبذول کرائی اور ان ہی کی فرمائش پر یہ مضمون لکھا گیا)

شری رام شرما صاحب ہندی کے مشہور ماہانہ رسالہ وشال بھارت کے ایڈیٹر ہیں۔ یہ ہندی اُردو دونوں زبانوں میں دست گاہ رکھتے ہیں وہ خود لکھتے ہیں کہ "میں نے بھی اُردو ہی پڑھی تھی، ہندی تو مجھے ویسے ہی آگئی"۔ ادبی لیاقت کے علاوہ اُن میں رواداری بھی بہت ہی۔ ہندو مسلم ملاپ کے بڑے حامی ہیں۔ انھوں نے حال ہی میں اپنے رسالے میں ایک مضمون زبان اور رسم خط کے مسئلے پر لکھا ہی۔ مضمون کے شروع میں انھوں نے اپنے پچھلے مہینے کے ایک نوٹ "اصلی اور فروعی مسئلے" سے ایک اقتباس دیا ہی جس میں وہ لکھتے ہیں کہ:

"بعض لوگوں کا یہ خیال ہی کہ ہندو مسلم اختلاف کی جڑ میں بھاشا کا سوال ہی اور مسلمانوں کے دلوں میں ہندوؤں کی طرف سے بدگمانی ہی۔ اس لیے ان کی یہ رائے ہی کہ ہندی اُردو کا جھگڑا مٹانے کے لیے "ہندستانی" پر زور دیا جائے اور یک ساں زبان کے لیے کوشش کی جائے تو سب مُشکلیں دُور ہو جائیں گی۔ ہم ہندی اُردو کے جھگڑے کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ اگر دونوں کا ایک رسم خط ہو جائے تو یہ جھگڑا بہت کچھ مٹ جائے گا۔ لیکن

ہم اپنے بہکے ہوئے دوستوں سے پوچھتے ہیں کہ ڈھاکہ اور احمد آباد میں تو بھاشا کا کوئی جھگڑا نہ تھا پھر وہاں فرقہ وارانہ جھگڑے کیوں ہو گئے؟ ملک کی غلامی ہماری اصل مصیبت ہے۔ ہماری تقریباً تمام بلاؤں کا سرچشمہ یہی ہے۔ اگر ہمیں اس سے نجات مل گئی تو یہ فروعی جھگڑے اپنے آپ مٹ جائیں گے۔ جب جھگڑوں کی سوت سوکھ جائے گی تو زبان کے زہر کا نالہ خود ہی سوکھ جائے گا۔"

اس اقتباس میں تین باتیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک تو یہ کہ زبان کو ہندو مسلمانوں کے اختلاف میں کوئی زیادہ دخل نہیں۔ دلیل یہ پیش کی گئی ہے کہ ڈھاکہ اور احمد آباد میں فساد کیوں ہوئے وہاں تو زبان کا کوئی جھگڑا نہیں۔ دوسری بات یہ کہ فساد کی جڑ ملک کی غلامی ہے اگر اس سے نجات مل جائے تو سب جھگڑے مٹ جائیں گے۔ تیسری بات یہ کہ دونوں (یعنی اُردو ہندی) کا ایک رسمِ خط ہو جائے تو زبان کا کوئی جھگڑا نہیں رہے گا۔

پہلی بات کے متعلق یہ عرض ہے کہ جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ہندو مسلم اختلاف کی جڑ میں زبان کا سوال ہے۔ انھوں نے ملک کی حالت کا بہت صحیح اندازہ کیا ہے اور وہ ہندو مسلم اختلاف کی حقیقت سے پورے طور پر واقف ہیں۔ اس کے برخلاف احمد آباد اور ڈھاکہ کو جو ثبوت میں پیش کیا گیا ہے وہ ایک بھولے پن کی بات ہے اور کسی بچّے کے مونھ سے نکلتی تو تعجب نہ ہوتا۔ معلوم ہوتا ہے

کہ ان صاحبوں نے ہندو مسلم نزاع کے اسباب پر کبھی سنجیدگی سے غور نہیں کیا۔ اور نہ کبھی ملک کے مختلف علاقوں میں سفر کر کے وہاں کے حالات کو گہری نظر سے دیکھا ہے۔ ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ جن مقامات کی مادری زبان اُردو نہیں یا جہاں اُردو کا رواج کم ہے وہاں والوں کے دل میں اُردو کا جو احترام ہے وہ اُن لوگوں میں نہیں پایا جاتا جن کی مادری زبان اُردو ہے۔ وہ اُسے ایک طرح کی مقدس زبان خیال کرتے ہیں اور جب وہ یہ سُنتے اور دیکھتے ہیں کہ اُردو زبان کی مخالفت کی جا رہی ہے اور اس کے مٹانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں تو ان کے دلوں میں مخالفت اور نفرت کی آگ بھڑک اُٹھتی ہے اور صحیح یا غلط وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ اُردو کے مٹانے کی کوششیں نہیں بلکہ ان کی تہذیب اور مذہب کو مٹانے کی تجویزیں ہیں اور احمد آباد اور ڈھاکہ کی جو مثالیں پیش کی ہیں وہ بھی صحیح نہیں کیوں کہ ان مقامات میں ہزاروں کی تعداد میں ایسے لوگ موجود ہیں جن کی مادری زبان اُردو ہے اور اُن سے کہیں زیادہ ایسے ہیں جو اُردو جانتے اور بولتے ہیں۔

غُلامی کا جُوا اتار پھینکنے کا خیال بہت خوب ہے اور کوئی معقول شخص اس سے اختلاف نہیں کر سکتا اور یہ بھی صحیح ہے کہ جب ایک بار غلامی سے نجات مل گئی تو سب فروعی جھگڑے مِٹ جائیں گے لیکن سوال یہ ہے کہ غلامی سے نجات کیوں کر ملے اور وہ کیا طریقہ ہے جو ہمیں اس سے نجات دلا سکتا ہے؟ کیا اس مقصد کے حاصل کرنے کے یہی ڈھنگ ہیں جو ہم آج کل دیکھ رہے ہیں کہ

تقریباً ہر معاملے میں جھگڑا اور ہر مسئلے میں اختلاف۔ اور بجائے اس کے کہ ان جھگڑوں کو کم کیا جائے۔ اُن کو بڑھانے اور اُکسانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اگر یہی کچھن ہیں تو کوئی توقع نہیں کہ غلامی کا طوق ہماری گردنوں سے اُتر جائے۔

یہ سچ ہے کہ ہم فروعی مسائل میں اُلجھے رہتے ہیں اور اصل کی طرف پوری توجہ نہیں کرتے۔ اور بہ قول شرما صاحب کے ہندی اُردو کا جھگڑا بھی فروعی مسائل میں سے ہے۔ اور صحیح یہ ہے کہ جڑ اگر مضبوط رہی تو شاخیں اور تنے اور سارا درخت سرسبز اور شاداب رہے گا۔ لیکن انھیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جب فروعی جھگڑے شدت پکڑ جاتے ہیں تو وہی رفتہ رفتہ اصل ہو جاتے ہیں۔ ہمیشہ یہی نہیں ہوتا کہ جڑ کے کھوکھلے ہونے سے درخت بے کار ہو جاتا ہے بلکہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ تنے کی چھال اُتار لینے سے درخت کا پنپنا بند ہو جاتا ہے اور وہ ٹھنٹھ ہو کے رہ جاتا ہے۔ ہماری بدقسمتی سے اور ہمارے رہ نماؤں کی غلطیوں سے اُردو ہندی کا جھگڑا اب فروعی مسائل میں سے نہیں رہا، اصل مسئلہ ہو گیا ہے۔

اس کے بعد وشال بھارت کے قابل ایڈیٹر نے اس جھگڑے کی اصل حقیقت پر نظر ڈالی ہے اور یہ سوال کیا ہے کہ ہندی اُردو کا جھگڑا کہاں اور کن صوبوں میں ہے؟ اس کا جواب انھوں نے کسی قدر تفصیل سے دیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ بنگال، آسام، گجرات، مدراس، اڑیسہ، سندھ، مہاراشٹر، کرناٹک اور ملیبار میں ہندی اُردو کا کوئی جھگڑا نہیں۔ اب رہے سرحد، پنجاب، یو پی، بہار اور سی پی کے صوبے تو ان میں بھی

ہندی اُردو کا جھگڑا

صرف یو پی اور پنجاب ایسے دو صوبے ہیں جو ہندی اُردو جھگڑے کا اکھاڑہ بنے ہوئے ہیں۔ بہار میں اُردو کی کوئی حیثیت نہیں۔ مختصر یہ کہ یو پی کے صرف چند فی صدی شہری لوگ اُردو بولتے ہیں۔ پنجاب میں پنجابی بولی جاتی ہے اور رسم خط اُردو، ہندی، گورمکھی تینوں رائج ہیں لہٰذا جھگڑا ہے تو انھی دو صوبوں میں۔

کیا اچھا تبصرہ اور فیصلہ ہے۔ بہار کو صرف ایک فقرے میں اُڑا دیا ہے کہ وہاں اُردو کی کوئی اہمیت نہیں۔ حالاں کہ ہندی اُردو جھگڑے کی ابتدا ہیں سے ہوئی اور اب تک جاری ہے۔ بہار کے شہروں، قصبوں اور دیہات میں ایک کثیر آبادی ایسی ہے جس کی زبان اُردو ہے۔ عظیم آباد پٹنہ اُردو زبان و ادب کا ایسا ہی مشہور اور بڑا مرکز تھا۔ جیسے دلّی اور لکھنؤ۔ بہار نے اُردو کے ایسے نامور ادیب اور شاعر پیدا کیے ہیں جو اُردو ادب کی تاریخ میں یادگار رہیں گے۔ اُردو کو تو خیر سری شرما نے یو پی کے شہروں کے چند ہزار (زیادہ سے زیادہ چند لاکھ) نفوس تک محدود رکھا ہے لیکن ہم اُن سے باادب یہ پوچھتے ہیں کہ وہ نئی ہندی جس کے پرچار کے لیے طرح طرح کے جتن کیے جا رہے ہیں وہ کس علاقے، کس شہر اور قصبے اور کس گاؤں کی بولی ہے؟ اور اس کے بولنے والے کتنے دیس میں بستے ہیں؟

وہ اُردو کو ہندی یا ہندی کی بعض ثناخوں کی طرح مقامی خیال کرتے ہیں۔ حالاں کہ یہ بات نہیں ہے۔ اُردو ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک سارے ہندستان پر چھائی ہوئی ہے۔ صوبہ سرحد، سندھ، خاندیس، کرناٹک، دھاروار، گجرات، سی۔ پی اور مدراس میں

ہزاروں لاکھوں آدمیوں کی مادری زبان اُردو ہے اور ان مقامات میں بے شمار لوگ ایسے آباد ہیں جو اُردو جانتے، بولتے اور لکھتے ہیں جس کی تفصیل میں اپنے دوروں کے ضمن میں بیان کر چکا ہوں۔ ان میں کے بعض مقام اُردو زبان کے مرکز رہے ہیں۔ اور قریب قریب ان میں سے ہر مقام میں اُردو اخبار جاری ہیں اور شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔

شرما صاحب نے ہندی اُردو جھگڑے کو صرف یو۔پی اور پنجاب تک محدود کر دیا ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ اُردو کی وسعت غیر محدود ہے اور وہ ایک طرح سے کُل ہند زبان ہے اور جیسا کہ میں اوپر بیان کر چکا ہوں جن مقامات کے مسلمانوں کی مادری زبان اُردو نہیں یا جہاں اُردو کا رواج نسبتاً کم ہے وہاں کے مسلمان اُردو کو ہم سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ جب اُردو کو ذرا سی بھی ٹھیس لگتی ہے تو وہ بے چین ہو جاتے ہیں۔

بے شک ایک زمانے میں ہندی اُردو کا جھگڑا مقامی جھگڑا تھا۔ لیکن جب سے گاندھی جی نے اس مسئلے کو اپنے ہاتھ میں لیا اور ہندی کی اشاعت کا بیڑا اُٹھایا اور یہ اعلان کیا کہ وہ ہندی کو ملک کی مشترکہ زبان بنا کے چھوڑیں گے اُسی وقت سے سارے ملک میں ایک آگ سی لگ گئی اور فرقہ واری عناد اور فساد کی مستحکم بُنیاد پڑ گئی۔ کانگرس گورمنٹ نے جو اصل میں مہاتما کی حکومت تھی، اس جلتی ہوتی آگ پر خوب تیل چھڑکا۔ اس معاملے میں حکومت کے بعض وزرا اور معزز ارکان کانگرس گورمنٹ کے وزیر یا کانگرس کے

ممبر نہیں رہے تھے بلکہ وہ ہندی زبان کے مشنری بن گئے تھے اور
کانگرس کے گزشتہ فیصلوں اور قرار دادوں اور کانگرس کے آئین کو
بالائے طاق رکھ دیا تھا، کانگرس گورمنٹ نے اس جھگڑے کو اور
بڑھایا اور پھیلایا اور ترقی دی۔ کیوں کہ کانگرس کی آواز مہاتما
کی آواز تھی اور مہاتما کی آواز اہلِ کانگرس اور کروڑوں عوام
کے لیے بہ منزلہ الٰہی آواز کے تھی۔ مہاتما گاندھی نے (خدا اُن کو
نیک ہدایت دے) اس معاملے میں ملک کے حق میں ایسے کانٹے
بوئے ہیں اور وہ بِس پھیلایا ہے اور مختصر یہ کہ وہ کام کیا ہے جو
اس ملک کا بڑا سے بڑا اور سخت سے سخت دشمن بھی نہیں کرسکتا
تھا۔ ہم ملک کی ابتری اور آئے دن کے جھگڑوں اور اختلافات
کے لیے غیروں کو الزام دیتے ہیں مگر اپنے گریبان میں مونھ ڈال کر
کبھی نہیں دیکھتے۔

ہندو مسلمانوں میں جس چیز نے سب سے زیادہ بدگمانی، نفرت
اور باہمی عناد کو بڑھایا وہ ہندی اُردو کا جھگڑا ہے اور اس جھگڑے
کے بانیِ اعظم "مہاتما" گاندھی ہیں۔ میں یہاں پنڈت سندرلال کی
تقریر کے دو ایک فقرے نقل کرتا ہوں:

"اُردو ایک ہندستانی زبان ہے جسے ہندوؤں
مسلمانوں نے مل کر بنایا اور ترقی دی اور اب بھی صوبۂ
متحدہ کے بہت سے ضلعوں میں، شہروں اور دیہات
ہر جگہ کے ہندو اُردو ہی بولتے ہیں اور موجودہ زمانے
کی سنسکرت آمیز ہندی نہیں سمجھ سکتے...... اس

سنسکرت آمیز ہندی کو قومی زبان کی حیثیت سے رائج
کرنے کی کوشش نہ صرف ہندی کے لیے بلکہ قومی اتحاد
کے لیے سخت مضر ہے۔۔۔۔۔۔ اس کوشش نے
ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ایک خلیج پیدا کرنے
میں بڑا حصہ لیا ہے"

پنڈت جی کا یہ قول حرف بہ حرف درست ہے۔

اُردو رسمِ خط کے متعلق شرما صاحب فرماتے ہیں کہ "علمی اشاعت میں اُردو لپی (رسمِ خط) خود ہی مرے گی اس کو ختم کرنے کی کوشش کرنا مرتے کو مارے شاہ مدار کا حکم رکھتا ہے" یہ کلمہ بڑے غرور کا ہے اور ایسے بڑے بول صرف اکثریت کا غرور ہی بلوا سکتا ہے۔ زبان اور تہذیب کے مسائل، تعداد کی کمی بیشی، اوسط اور فی صدی کے حساب سے طے نہیں ہوا کرتے۔ اس کے لیے کسی قدر رواداری، ہمدردی اور انصاف کی بھی ضرورت ہے۔ اُردو کا رسمِ خط ہندی کی طرح صرف ہندستان کے ایک آدھ علاقے تک محدود نہیں بلکہ یہ ہندستان کے باہر بھی بہت سے ملکوں میں رائج ہے۔ کہاں کہاں ہٹائیں گے۔ یہاں یہ رسمِ خط اُردو کی پیدائش کے ساتھ ساتھ آیا ہے۔ اس کا ہٹانا آسان نہیں۔

ہندستان میں ایک دو رسمِ خط نہیں بیسیوں ہیں۔ سب سے پہلے بنگالی، تامل، تلنگی، کنڑی، ملیالم وغیرہ زبانوں کو یہ مشورہ دینا چاہیے جن کی نسبت یہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ سنسکرت سے بہت قریب بلکہ سنسکرت کے بچے ہیں۔ اس کے بعد اُردو کی

باری آئے گی۔

خطوں کے بدلنے سے دل نہیں بدلتے۔ اوّل دلوں کے بدلنے کی کوشش کرنی چاہیے اور اس کے لیے جیساکہ میں نے ابھی کہا ہو رواداری، ہمدردی اور انصاف کی ضرورت ہی۔ ہمارے ملک میں سب سے بڑے شخص نے سب سے زیادہ دلوں کے بدلنے کا پرچار کیا اور اس کے لیے دعائیں مانگیں مگر افسوس کہ اس نے دلوں کو ایسا بدلا ہی کہ فی الحال ان کے ملنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

زبان کا مسئلہ معمولی نہیں۔ اس پر ہاتھ ڈالنا بہت خطرناک ہی۔ دنیا کی تاریخ شاہد ہی کہ جہاں کہیں ایسا کیا گیا وہاں صرف ناکامی ہی نہیں اُٹھانی پڑی بلکہ اس کے ساتھ بہت سی بلائیں اور آفتیں نازل ہوئیں اور انقلاب رُونما ہوئے اور باوجود شدید مظالم اور عذابوں کے زباں بندی اور نظر بندی اور قانونی شکنجوں کے ظالم مظلوموں کی اور زبردست زیردستوں کی زبانوں کو نہ مٹا سکے۔ برخلاف اس کے یہ ظلم اور عذاب اور سختیاں ان زبانوں کی ترقی کا باعث ہوئیں۔

(ہماری زبان ۱۶ر جولائی ۱۹۴۱ء)
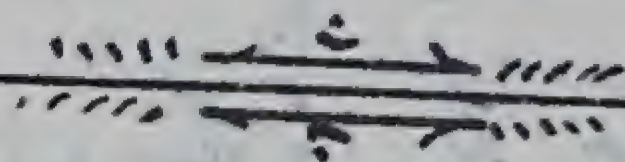
حامیانِ اُردو

زبانیں کہاں سے آئیں کیسے بنیں؟ ایک طویل اور پیچیدہ بحث ہے اور اس وقت ہمارے مبحث سے خارج۔ البتہ اُردو کہاں سے آئی اور کیسے آئی؟ یہ ہم بتا سکتے ہیں۔ اس لیے کہ اس کی عمر چھ سات سو سال سے زیادہ نہیں۔ اسے قدرت، انسانی ذوق اور انسانی ضروریات نے بنایا۔

کچھ دیر کے لیے آپ چہل قدمی کو کسی قدیم جنگل میں چلے جائیے۔ وہاں آپ کو تناور اور گرانڈیل درخت، چھوٹے بڑے پودے، طرح طرح کی بیلیں، پھولوں کے تختے، قسم قسم کی گھاسیں، جڑی بوٹیاں وغیرہ نظر آئیں گی۔ آپ درختوں میں پھل بھی لگے دیکھیں گے۔ بہت سے ایسے جنھیں ہم جانتے ہیں مثلاً: کیلے، انجیر، آم وغیرہ اور بہت سے ایسے جو ہم نے کبھی نہیں دیکھے تھے۔

اس کے بعد کسی اچھے باغ میں جائیے۔ یہاں بھی سایہ دار اور ثمردار درخت اور خوش نُما پھُول اور پھل دیکھنے میں آئیں گے۔ یہ سب چیزیں باغوں اور چمنوں کی زینت ہیں، جنگل سے آتی ہیں۔ لیکن انسان نے اپنی عقل وتمیز سے ان میں حیرت انگیز شگوفہ کاریاں کی ہیں۔ ایک آم ہی کو لیجیے۔ ایک جنگل کا آم ہے، دوسرا باغ کا آم، دونوں کے ذائقے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ انسان نے اپنی حکمت سے ان میں طرح طرح کی ایجادیں کی ہیں۔ قلم باندھ باندھ کر بے شمار قسمیں بنائیں اور ان میں، لطیف خوش بو،

ذائقے اور لذتیں پیدا کیں۔ اوّل اوّل یہ سب کچھ ہمیں ذوق کی بدولت میسر آیا، پھر تجارت نے اُسے اُبھارا۔ شوق اور تجارت نے مقابلے پر اُکسایا، مقابلے نے کش مکش پیدا کی، یہ کش مکش ہی جو بناتی، سنوارتی اور اُبھارتی ہی۔ کائنات کی ہر چیز کی بقا اس کی کش مکش پر ہی۔

قریب قریب یہی حال ہماری اُردو زبان کا ہی۔ جس وقت یہ وجود میں آرہی تھی کسی کو اس کا علم تو کیا احساس بھی نہ تھا کہ کوئی نئی زبان بن رہی ہی۔ البتہ قدرت یعنی "تقاضائے وقت" اپنا کام کر رہا تھا۔ قدرت کے قانون بھی عجیب و غریب اور پُراسرار ہوتے ہیں۔ وہ اپنا کام چُپکے چُپکے کرتے ہیں خواہ کسی کو خبر ہو یا نہ ہو انسانی معاملات میں یہ عجیب بات ہی کہ جو چیز سب سے قریب ہوتی ہی اس پر سب کے بعد نظر پڑتی ہی جب کہ ہم فارسی، عربی، سنسکرت پر فریفتہ تھے اور ان کی تصانیف اور کلام کے مزے لے رہے تھے۔ یہ غریب اور حقیر بولی چُپکے چُپکے ہمارے گھروں، بازاروں، خانقاہوں اور لشکروں میں گھر کر رہی تھی۔ میں نے اسے غریب اور حقیر اس لیے کہا کہ اس وقت یہ بازاری اور عامیانہ خیال کی جاتی تھی اور اہلِ ادب اور اہلِ ذوق اسے مونھ نہیں لگاتے تھے۔ یہاں تک کہ اس کا کوئی نام بھی نہ تھا جب دارالحکومت دہلی کی آس پاس کی بولی پر فارسی کی قلم لگی تو یہ وجود میں آئی۔ کسی نے دانستہ قلم نہیں لگائی اور نہ کسی جماعت اور انجمن نے یہ مشورہ دیا۔ یہ قدرت کے کام تھے۔ وقت کی بات تھی، وقت کا تقاضا اٹل ہی اسے کوئی نہیں روک سکتا۔ جو زمانے

کی ضرورت اور حالات کے مناسب ہوتا ہے۔ وہی ہو کے رہتا ہے۔ اس وقت اس کی ضرورت تھی۔ بولیاں اور موجود تھیں لیکن یہ سب مقامی اور محدود تھیں۔ حکومت کی وسعت کے ساتھ ایک عام اور وسیع زبان کی ضرورت تھی اور وہ صرف قلم لگانے ہی سے پیدا ہو سکتی تھی اور اس قلم لگانے میں فاتح اور مفتوح دونوں شریک تھے۔ جب اس قلمی زبان کی بوباس اور رسیلے پن سے لوگوں کے کام و دہن آشنا ہوتے تو اس کا چرچا پھیلا۔ فقیر اور صوفی، تاجر اور پیشہ ور، لشکری اور بازاری اسے دُور دُور تک لے گئے اور جہاں گئی مقبول ہو گئی۔ آخرکار جب یہ بے نام اور عوام کی بول چال سے نکل کر مسندِ ادب و انشا تک پہنچی تو پہلی بار اسے نام کا شرف بخشا گیا یعنی ریختہ کہلاتی اور بعد میں اُردو سے موسوم ہوئی جو اب اس کا عام اور مقبول نام ہے۔

اہلِ ذوق نے اسے سر آنکھوں پر رکھا۔ شعرا نے شعر و سخن کی محفلیں گرم کیں۔ فقرا اور صوفیا کی تلقین، واعظوں کے وعظ، بحث اور مناظرے سب اسی میں ہونے لگے۔ مصنفین اور مؤلفین نے کتابیں، مترجمین نے ترجمے اور افسانہ نویسوں نے افسانے اس میں لکھنے شروع کیے۔ اس وقت فارسی کا بول بالا تھا اس سے اس کا مقابلہ ہوا۔ مقابلے میں فارسی کی ہار اور اُردو کی جیت ہوئی۔ فارسی کو ہٹا کر دفتروں اور عدالتوں میں پہنچی۔ مدارس میں داخل ہوئی۔ ذریعۂ تعلیم بنی، اخبار رسالے جاری ہوئے۔ بہت سی انجمنیں اور ادارے اس کی حمایت اور اشاعت کے لیے قائم ہوئے۔ علم و ادب میں ترقی اور علوم و فنون میں کتابیں لکھی جانے لگیں۔ غرض ہر اعتبار سے

سارے ملک پر چھا گئی اور ہندوستان کی مشترکہ اور عام زبان مانی جانے لگی۔ اُردو کی یہ جیت ذوقِ ضرورت اور کشش ہمکش سے حاصل ہوئی اور اب بھی انھی کی بدولت ہو گی۔

ایک دن کا کام نہ تھا۔ اس میں صدیاں لگیں۔ یہ ہمارے بزرگوں کی (جس میں ہر قوم و ملت کے لوگ تھے) مسلسل مشقت اور محنت و کوشش اور جاں کاہیوں، دل سوزیوں اور قربانیوں کا نتیجہ ہے۔ یہ اُردو کے سچے حامی تھے۔ یہ ہمارے لیے بے بہا سرمایہ چھوڑ گئے ہیں جس کے ہم وارث ہیں۔ جو لوگ بزرگوں کے ورثے کو قائم رکھتے اور ترقی دیتے ہیں وہ سپوت کہلاتے ہیں، جو اس سے غفلت برتتے اور تلف کرتے ہیں وہ کپوت یعنی ناخلف ہیں۔ ہم ان بزرگوں کا ذکرِ خیر سے کرتے ہیں اس لیے کہ انھوں نے ایسا عظیم الشان کام کیا۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کا نام بھی نیکی سے یاد کیا جائے تو ان کی مثال اپنے سامنے رکھیے۔ ہم پر بڑی ذمّے داری ہے اس لیے کہ وقت نازک اور سخت ہے اُردو یوں ہی ایسی شیریں، وسیع اور علمی و ادبی زبان نہیں بن گئی۔ اس نے بڑی بڑی مصیبتیں اور آفتیں جھیلیں ہیں، بڑے بڑے مقابلے کیے ہیں۔ اس نے دیسی بولیوں کو نیچا دکھایا۔ اس لیے کہ وہ مقامی اور محدود نہیں۔ اس نے فارسی کو نکالا اس لیے کہ وہ غیر تھی۔ اس نے دوسری بولیوں پر فوقیت اور فضیلت حاصل کی اس لیے کہ اس میں ہندو مسلم دونوں کی تہذیبوں اور دونوں کے اتّحاد کی جھلک تھی اور اس لیے کہ اس کے حامیوں نے اس کے سنوارنے، بنانے اور ترقّی دینے میں

دل و جان سے جدوجہد کی اور اپنی کوشش میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ اب پھر وہی چال آ پڑی ہے، شہ مات بچنے کے لیے پہلے سے زیادہ جدوجہد اور سعی کی ضرورت ہے۔ اُردو کو جو حیثیت اور اہمیت حاصل ہو چکی ہے اسے قائم رکھنا حامیانِ اُردو کا فرض ہے۔ اگر ہم نے اسی ہمّت اور حوصلے سے کام لیا جو بزرگوں کا شیوہ تھا تو بلاشبہ جیت ہماری ہے۔ دل میں لگن ہو اور نیّت میں خلوص تو آدمی کیا کچھ نہیں کر سکتا۔

اکثر لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم اُردو کے لیے کیا کام کریں؟ جیسا کہ میں نے عرض کیا جو چیز سب سے قریب ہوتی ہے اس پر نظر نہیں پڑتی۔ کام کے لیے بہت وسیع میدان ہے۔ اس کے دو پہلو ہیں ایک زبان کے علم و ادب میں اضافہ اور ترقی، دوسرا زبان کی اشاعت جن لوگوں کو قدرت نے صلاحیت عطا کی ہے (بشرطے کہ ان کا صحیح اندازہ کیا گیا ہو) وہ علمی و ادبی تحقیقی کام کریں جن میں یہ استعداد نہیں وہ اشاعت میں کوشش کریں۔ اُردو کتابیں اور رسالے پڑھیں، دوسروں کو پڑھنے کی ترغیب دیں۔ گھروں میں خاص کر لڑکیوں اور عورتوں کو اُردو پڑھائیں۔ اُردو بولیں، لکھیں، خط پتر اُردو میں لکھیں، نام کی تختیاں اُردو میں ہوں، حساب کتاب اُردو میں لکھا جاتے۔ جہاں اُردو کے حق میں ناانصافی ہوتی ہو اس کی اصلاح کی کوشش کریں۔ اَن پڑھوں کو پڑھائیں، جہاں اُردو کا رواج کم ہو وہاں اسے رواج دیں جو ادارے اُردو کی ترقی و اشاعت کا کام کر رہے ہیں ان سے تعاون کریں، ان کی

مدد کریں۔ غرض اس قسم کے سینکڑوں کام ہیں جو ہر شخص اپنی بساط اور حالات کے مطابق کرسکتا ہے۔ امداد کے متعلق ایک بہت پُرانا اور نہایت پامال اور فرسودہ مقولہ ہے۔ تاہم یاد رکھنے کے قابل ہے۔ دامے، قدمے، سخنے، جس کسی نے یہ مقولہ بنایا تھا وہ بڑا دانش مند تھا۔ اس کی عقل مندی اس ترتیب میں ہے جو اس نے قائم کی ہے۔ سب سے مقدم "دامے" کو رکھا ہے۔ یہ بڑا ٹیڑھا معاملہ ہے۔ کہتے ہیں "دینا" بڑی مشکل ہے لیکن "لینا" بھی کچھ آسان نہیں۔ اس مشکل کو آسان کیجیے۔ دینے کی عادت ڈالیے اور اتنا دل کھول کر دیجیے کہ مانگنے کی حاجت نہ رہے۔ دوسرا درجہ "قدمے" کا ہے یعنی جو دام نہیں دے سکتے وہ جدوجہد اور سعی کریں۔ آخری درجہ "سخنے" کا ہے۔ لیکن آج کل معاملہ برعکس ہوگیا ہے "سخنے" اوّل ہوگیا ہے اور "دامے" آخیر ہم باتیں بہت کرتے ہیں اور کام کم۔ زیادہ تقریریں کرنے سے قوّتِ عمل ضعیف ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے کام ضعیف ہیں۔ جو شخص اور قومیں کام سے جی چُراتی ہیں انھیں کبھی آزادی نصیب نہیں ہوسکتی۔ انسان کی نجات استقلال سے محنت اور کام کرنے میں ہے۔ کسی کو باتیں اور تقریریں کرنے کا حق نہیں۔ جس نے کچھ کرکے نہ دکھایا ہو۔ خالی باتیں طبل تہی کی آوازیں ہیں۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ ہمارے گھروں، کالجوں اور چائے خانوں اور دفتروں میں جلی قلم سے جگہ جگہ یہ لکھ دیا جائے:

"باتیں کم اور کام زیادہ"

فردوسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

بزرگی سراسر زگفتار نیست
دو صد گفتہ چوں نیم کردار نیست

تقریر

(سندھ پراونشل اُردو کانفرنس منعقدہ ۸ اپریل ۱۹۴۷ء کی افتتاحی تقریر)

اے صاحبو! آپ نے اس وقت صوبائی اُردو کانفرنس کا انعقاد کرکے وقت کی ایک بہت بڑی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ یہ بڑا انقلاب انگیز اور ہنگامہ خیز زمانہ ہے۔ ہمیں اپنے حالات، اپنی ضرورتوں، اپنی خامیوں اور اہلیتوں کا جائزہ لینا اور اس اٹل وقت کے لیے تیار رہنا ہے جو نئے سامان اور ارادوں کے ساتھ آنے والا ہے۔ زمانہ کسی کی رُو رعایت نہیں کرتا۔ جو نئے حالات کے لیے تیار نہیں وہ نااہل سمجھے جائیں گے اور جو نااہل ہیں وہ سب سے زیادہ معتوب اور مغضوب ہوں گے۔ موجودہ زمانے اور حالات ہی میں نہیں بلکہ ہر زمانے میں انسانی زندگی اور تہذیب و تمدن کی ترقی میں زبان نے بڑا کام کیا ہے۔ بلکہ بہت کچھ اسی پر دارومدار رہا ہے۔ اگر گہری اور باریک نظر سے دیکھا جائے تو زبان کا مسئلہ قومیت کا مسئلہ ہے۔ اب آپ زبان کو اس نظر سے دیکھیے اور پھر ہماری اور اپنی کوششوں کو جانچیے اور پرکھیے۔

یہ بات میں خاص طور پر آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں کہ ہم کسی زبان یا بولی کے مخالف نہیں اور نہ کسی زبان اور بولی کی ترقی کی راہ میں حائل ہیں۔ مادری زبان ہر ایک کو عزیز ہوتی ہے اور ہونی چاہیے۔ اپنے حلقے میں اس کا ایک خاص درجہ ہے اور وہاں اس کے کارآمد ہونے میں شبہ نہیں۔ لیکن اس کے علاوہ ایک اور

زبان بھی ہو جس کا درجہ مادری زبان سے بھی مقدم ہو اور وہ قومی زبان ہو۔ سندھی ہو یا پنجابی یا کوئی اور بولی صرف اپنے حلقے میں محدود ہیں، اس سے باہر کچھ کام نہیں آتیں۔ سارے ملک ہندستان میں اُردو ہی ایک ایسی زبان ہو جو اکثر صوبوں میں بلکہ تقریباً ملک کے ہر علاقے میں بولی یا سمجھی جاتی ہو اور ملکی یا قومی زبان ہونے کا حق رکھتی ہو۔ کیوں کہ یہ مختلف فرقوں اور قوموں اور تہذیبوں کے میل سے بنی ہو اور ہندو مسلمانوں اور دوسری قوموں نے اس کے بنانے میں اور ترقی دینے میں مل کر کوشش کی ہو اور یہی وجہ ہو کہ اس میں ان سب کے خیالات و جذبات اور تہذیبوں کا رنگ پایا جاتا ہو۔ اس کے رواج سے آپ کا رشتہ اپنے تمام بھائیوں سے اور ملک کی دوسری قوموں سے زیادہ مستحکم اور قوی ہو جائے گی۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ سندھی نہ رہے۔ وہ ضرور رہے گی اور اُسے رہنا چاہیے، لیکن اس کے ساتھ ہی قومی زبان کا سیکھنا پڑھنا لازم قرار دیا جائے تاکہ قومیت کی رُوح افسردہ نہ ہونے پائے۔

مجھے یہ معلوم کر کے بہت خوشی ہوئی کہ مجلسِ نصاب نے جو آپ کی حکومت نے مقرر کی تھی بالاتفاق یہ فیصلہ کیا ہو کہ پرائمری درجے کے بعد ہندستانی (یعنی اُردو) کی تعلیم لازم ہونی چاہیے کیوں کہ "ہندو مسلم اتحاد کا صرف یہی ایک حل ہو۔ مجلس کی یہ رائے بہت صحیح، قابلِ وقعت اور دُور اندیشی پر مبنی ہو لیکن ساتھ ہی کمیٹی نے اس رائے کا بھی اظہار کیا ہو کہ پرائمری درجے میں اُردو کو داخل کرنا طالب علموں کے لیے بار ہو گا۔ لیکن اس

بار کے کم کرنے کی ایک صورت یہ ہوسکتی ہے کہ پرائمری کی تیسری اور چوتھی جماعت میں چھوٹی چھوٹی دو آسان ریڈریں ایسی داخلِ نصاب کردی جائیں جن میں زیادہ تر وہ لفظ ہوں جو سندھی اور اُردو میں مشترک ہیں تو ان کا پڑھنا طالب علموں کے لیے کچھ زیادہ بار نہ ہوگا۔ خاص کر جب کہ سندھی اور اُردو کا رسمِ خط تقریباً یک ساں ہے۔ انٹر پراونشل بورڈ فار اینگلو انڈین اینڈ یورپین ایجوکیشن نے بالاتفاق یہ طے کیا ہے کہ اُن کے مدارس میں اُردو پہلی جماعت سے پڑھائی جائے جب کہ اینگلو انڈین اور یورپین لڑکوں کے لیے پہلی جماعت سے اُردو سیکھنا بار نہیں ہے تو سندھی لڑکوں کے لیے تیسری اور چوتھی جماعت میں اُردو کا پڑھنا ہرگز بار نہیں ہوسکتا۔ خصوصاً جب کہ اُن کے لیے رسمِ خط کی وہ دشواری نہیں جو اینگلو انڈین اور یورپین لڑکوں کے لیے ہے۔ میری راے میں مجلسِ نصاب کے اس فیصلے پر نظرِ ثانی کی ضرورت ہے۔

ایک دُوسری تجویز جس کی طرف میں آپ کی توجہ مبذول کرنا چاہتا ہوں یہ ہے کہ جس طرح حکومت نے سندھی زبان کے لیے ایک بورڈ قائم کیا اسی طرح اور اسی نہج پر اُردو زبان و ادب کی ترقی کے لیے بھی ایک بورڈ قائم کیا جائے۔ اس بورڈ کے قائم ہونے سے بہت سے فوائد متصوّر ہیں۔ اس کے قیام سے قومی اور ملکی زبان کی ترویج و اشاعت ایک اصول کے تحت قابلِ اطمینان طور پر ہوگی۔

ہمیں حکومت سے ایک اور ضروری درخواست کرنی پڑے گی وہ یہ کہ دیوانی اور فوج داری عدالتوں میں ایسی درخواستیں جو

اُردو زبان اور رسمِ خط میں لکھی ہوں، قبول کر لی جائیں۔ جب یہ امر طے پا گیا کہ صوبے کی تعلیم میں ہندستانی زبان کا داخل کرنا قومی اور ملکی اتحاد کے لیے لازم ہے تو اس درخواست کے قبول کرنے میں کوئی امر مانع نہ ہونا چاہیے۔ یہ امر اس اتحاد کے بڑھانے میں بہت زیادہ ممد اور معاون ہو گا۔ جس مصلحت کی بنا پر اس زبان کا مدارس میں داخل کرنا روا رکھا گیا ہے اسی مصلحت کے پیشِ نظر ہماری یہ درخواست ہے (اگر حکومت نے ہماری ان معمولی درخواستوں کو منظور کر لیا اور قوی امید ہے کہ صحیح طریقے پر یہ مسائل پیش کیے گئے تو ضرور منظور کر لیے جائیں گے) تو آپ یقین جانیے کہ اُردو زبان آپ کی زبان ہو جائے گی۔

یہ ہمارے سامنے کی بات ہے کہ جب سے پنجاب نے اُردو کو اپنا بنا لیا تو ان میں ایسے اعلا درجے کے صاحبِ فکر، شاعر اور ادیب اور انشا پرداز پیدا ہوئے اور ہیں جن پر ہمیں بجا طور پر فخر ہے۔ اگر وہ اُردو کو اختیار نہ کرتے تو کیا وہ اس قابلِ رشک درجے تک پہنچ سکتے تھے۔ یہ سب اُردو کا طُفیل ہے۔ اگر آپ نے بھی یہ تہیہ کر لیا تو یقین جانیے کہ چند ہی سال میں آپ ایسی ترقی کریں گے کہ لوگوں کو حیرت ہو گی۔ کیوں کہ آپ کی سیرت اور آب و ہوا میں کچھ چیزیں ایسی پائی جاتی ہیں جنھیں دوسروں پر تفوّق حاصل ہے۔ جب پنجاب میں اُردو کی ترقی سے پنجابی کم نہیں گئی تو آپ کو اندیشے کی کوئی وجہ نہیں بلکہ میرا یقین ہے کہ اُردو کی ترویج سے سندھی کو طرح طرح کے فائدے پہنچیں گے۔

اُردو زبان کا دامن بہت وسیع ہو گیا ہے اور اس نے اپنی

گوناگوں صلاحیتوں کی وجہ سے حیرت انگیز ترقی کی ہو۔ مذہب، تاریخ، ادب اور دیگر علوم وفنون پر کتابوں کی جو نہایات اُردو میں ہو وہ ہماری کسی زبان میں نہیں۔ یہ سارا علمی وادبی ذخیرہ بنا بنایا آپ کی ملک ہو جائے گا۔ کسی مقامی بولی کو اس درجے تک پہنچنے کے لیے سالہا سال درکار ہوں گے اور پھر بھی شبہ ہو کہ وہاں تک پہنچے یا نہ پہنچے اور اس میں تو مطلق شبہ نہیں کہ ہندستان کی کوئی صوبائی بولی بین صوبائی اور بین قومی زبان کبھی نہیں بن سکتی۔

اس زمانے میں جب کہ ہمارے ملک میں اندر اور باہر نفاق و اِفتراق کی آگ بھڑک رہی ہو۔ اس کے ٹھنڈا کرنے کے لیے اُردو ہی کام آسکتی ہو۔ یہ کام اس نے پہلے بھی کیا تھا اور اب بھی یہ صلاحیت اسی میں ہو۔ یہ ٹوٹے ہوئے رشتوں اور دلوں کو جوڑے گی، بھٹکے ہوئے بھائیوں کو پھر یک دل و یک جان کر دے گی اور قومیت کی رُوح میں نیا ولولہ اور نئی اُمنگیں پیدا کر دے گی۔

میں اس کانفرنس کے منتظموں اور سرپرستوں کو تہِ دل سے مبارک باد دیتا ہوں کہ انھوں نے حالات کا صحیح اندازہ کر کے کراچی میں اس کا انعقاد کیا اور مجھے یقین ہو کہ اس کی کوششیں بارآور ہوں گی اور ہماری قومی زبان اُردو کی بنیاد بہ حُسن و خوبی قائم ہو جائے گی۔ اس یقین اور وثوق کے ساتھ میں دلی خلوص اور مسرت سے اس کانفرنس کے افتتاح کا اعلان کرتا ہوں۔ یہ تحریک آپ کو مبارک ہو اور جن آرزوؤں اور ارادوں سے آپ نے اس کام کو شروع کیا ہو وہ آپ کے حسبِ منشا پورے ہوں۔
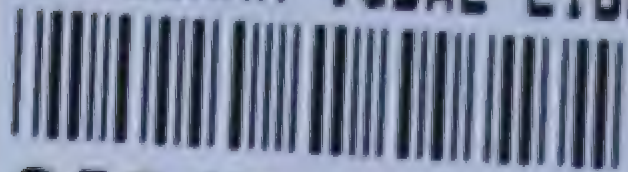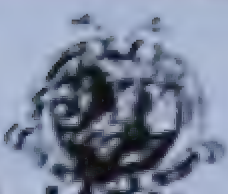
ہماری زبان

انجمنِ ترقیٔ اُردو (ہند) کا پندرہ روزہ اخبار

ہر مہینے کی پہلی اور سولھویں تاریخ کو شائع ہوتا ہے
چندہ سالانہ ایک روپیہ۔ فی پرچہ ایک آنہ

اُردو

انجمنِ ترقیٔ اُردو (ہند) کا سہ ماہی رسالہ

(جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شائع ہوتا ہے)

اس میں ادب اور زبان کے ہر پہلو پر بحث کی جاتی ہے تنقیدی اور محققانہ مضامین خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ اُردو میں جو کتابیں شائع ہوتی ہیں ان پر تبصرہ اس رسالے کی ایک خصوصیت ہے۔ اس کا حجم ڈیڑھ سو صفحے یا اس سے زائد ہوتا ہے۔ قیمت سالانہ محصول ڈاک وغیرہ ملا کر سات روپے سکۂ انگریزی (آٹھ روپے سکۂ عثمانیہ) نمونے کی قیمت ایک روپیہ بارہ آنے۔ (دو روپے سکۂ عثمانیہ)

سائنس

انجمن ترقیٔ اُردو (ہند) کا ماہانہ رسالہ

(ہر انگریزی مہینے کی پہلی تاریخ کو جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد سے شائع ہوتا ہے)
اس کا مقصد یہ ہے کہ سائنس کے مسائل اور خیالات کو اُردو دانوں میں مقبول کیا جائے۔ دنیا میں سائنس کے متعلق جو جدید انکشافات وقتاً فوقتاً ہوتے ہیں یا بحثیں یا ایجادیں ہو رہی ہیں ان کو کسی قدر تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے اور ان تمام مسائل کو حتی الامکان صاف اور سلیس زبان میں ادا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس سے اُردو زبان کی ترقی اور اہلِ وطن کے خیالات میں روشنی اور وسعت پیدا کرنا مقصود ہے۔ رسالے میں متعدد بلاک بھی شایع ہوتے ہیں۔ قیمت سالانہ صرف پانچ روپے سکۂ انگریزی (چھ روپے سکۂ عثمانیہ)
خط و کتابت کا پتا: معتمد مجلس ادارت رسالہ سائنس۔ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

انجمن ترقیٔ اُردو (ہند) دہلی

خطباتِ عبدالحق

حصہ اوّل

بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کی بعض پُر مغز اور یادگار تقریروں کا مجموعہ، تاریخِ ادبِ اُردو کے طلبہ کے لیے یہ خطبے نہایت مفید اور بصیرت افروز ہیں۔ قیمت مجلد ایک روپیہ (عہ) بلا جلد دس آنے

چند تنقیداتِ عبدالحق

اُردو کے محسنِ اعظم ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کے بعض دل چسپ و پُر مغز تنقیدی مضامین کا مجموعہ۔ قیمت صرف آٹھ آنے

اُردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام

تصنیف ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب۔ اس کتاب سے آپ کو معلوم ہوگا کہ اُردو زبان کی اشاعت و ترویج میں صوفیائے کرام نے کیا کام کیا۔ قیمت بلا جلد آٹھ آنے

مرہٹی زبان پر فارسی کا اثر

فارسی زبان کے جو اثرات مرہٹی کے قواعد و اسالیب اور مختلف نوعیتوں کی تحریروں پر پڑے ہیں ان کو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے اس کتاب میں نہایت وقابلیت سے واضح کیا ہے۔ قیمت آٹھ آنے (۸/)

انجمنِ ترقیٔ اُردو (ہند) دہلی